BIHAR URDU ACADEMY

اگست ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

آزادیٔ وطن مبارک

صبا عظیم آبادی

ہے تو کہنے کے لئے یاس کی تصویر صبا
آہِ مظلوم مگر بانگ درا ہوتی ہے

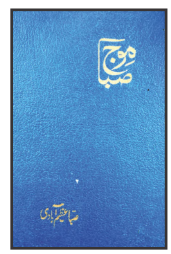

ہر شعر غزل کا ہے صبا ایک خزانہ
دیواں نہ سمجھنا ، مرا دیوانِ غنی ہے

زندگی میری

بہار عیش کا بگڑا ہوا نقشہ ہنسی میری
خمارِ غم کا اک لبریز ساغر زندگی میری
بڑھی جاتی ہے رہ رہ کر پریشاں خاطری میری
کسی کی زلف پرخم کی گرہ ہے زندگی میری
فروزاں ہے ، مگر افسردگی کا درس دیتی ہے
سبق آموز فطرت ہے یہ شمع زندگی میری
اِدھر ابوابِ یاس وغم کی ترتیبیں تھیں ، اُس جانب
مرتب ہو رہی تھی داستانِ زندگی میری
جہاں کے ذرّے ذرّے کی صبا تنظیم کی میں نے
ہے ناظم انتشارِ دہر کی یہ زندگی میری

صبا عظیم آبادی کا پورا نام سید محمود علی خاں ابن نواب سید احمد علی خاں ہے۔ وہ جمعہ ۲۳/اگست ۱۹۰۷ء کو اپنے موروثی مکان ''کاشانہ'' واقع سنگی دالان، پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزار کر جمعہ ۱۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنے ذاتی مکان واقع پٹنہ سیٹی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور گلزار باغ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں پٹنہ سیٹی اسکول، منگل تالاب میں ابتدائی درجات کی تعلیم اور ۱۹۲۳ء میں میٹرک کے بعد صبا نے نیو کالج پٹنہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ ۱۴ جون ۱۹۲۲ء وہ تاریخ ہے جب کہ صبا عظیم آبادی کو حضرت شاد سے تلمذ کا شرف ملا۔ صبا عظیم آبادی کا مجموعہ کلام ''موجِ صبا'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اور اس کے دو سال بعد ۱۹۵۶ء میں ان کی کتاب ''ریاض الانساب'' منظر عام پر آئی۔ صبا کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شاد کو ایک دبستان کے طور پر متعارف کرایا۔ ''شاد عظیم آبادی کے نورتن'' ان کی اہم حوالہ جاتی تصنیف ہے جو ۱۹۸۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی، مگر افسوس کہ اُن کی اچانک موت نے انہیں اپنی اس کاوش کو پکی روشنائی میں دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۸
اگست ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com
فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرفِ آغاز	ابرار احمد خان	۳
ذکرِ وطن	ذکرِ وطن اور اردو شاعری	ڈاکٹر نشاط اختر	۴
	جمیلؔ مظہری کی دو وطنی نظمیں: ایک تجزیہ	انجم الزماں	۱۱
	اے زمین وطن / سرزمین ہند	شجاع الدین شاہدؔ / حامدؔ حسین ندوی	۱۴
	عظمت ہندوستاں	محمد مصطفیٰ غزالیؔ	۱۵
مقالات	عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری	پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم	۱۶
	ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری کی بازگشت	ڈاکٹر سید احمد قادری	۲۰
	ذبیح اللہ صفا کی بیدلؔ شناسی	ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی	۲۳
	مولانا الطاف حسین حالیؔ: قومی یکجہتی کے باوا	ساحرؔ داؤدنگری	۲۷
یادیں	راشد انور راشدؔ: یادیں اور باتیں	ڈاکٹر ابرار رحمانی	۳۱
	بدنامؔ نظر: یادوں کے آئینے میں	احمد صغیر	۳۵
	ظفرؔ رانی پوری: کچھ یادیں کچھ باتیں	ڈاکٹر صابر علی سیوانی	۳۸
افسانے	بوجھ	محمد طارق	۴۳
	رنگ	احمد ریاض	۴۵
	ماں کا شکم	امتیاز غدر	۴۷
طنز و مزاح	لیٹ	طبیب احسن تابش	۵۰
منظومات	مناجات / نعت پاک	معین کوثرؔ / حافظ تمناؔ پھلواروی	۵۲
	غزلیں	وارثؔ ریاضی / ظفر اقبال ظفرؔ	۵۳
	غزلیں	خالد عبادیؔ	۵۴
	غزلیں	توقیر عالم توقیرؔ / محمد ضمیر رضاؔ	۵۵
	غزلیں	ڈاکٹر شمع ناسمین نازاںؔ	۵۶
	غزلیں	سلیمؔ سرفراز	۵۷
	غزلیں	انور جاوید شاداںؔ	۵۸
کتابوں کی دنیا	پسِ غبارِ وجود — منظر اعجاز	مبصر: عبدالرزاق رضویؔ	۵۹
	غزال آنکھیں چراتے ہیں...... — فخرالدین عارفی	مبصر: ڈاکٹر طاہر الدین طاہرؔ	۶۱
سلام و پیام	فردوسؔ گیاوی، پیکر رضویؔ، ڈاکٹر شائستہ خاتون، ترنم جہاں، اشفاق عادلؔ، سلطان احمد ساحلؔ		۷۰

بچوں کا زبان وادب ۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

بحمدہٖ تعالیٰ ـــــ ’’زبان وادب‘‘ کا تازہ شمارہ ’’ذکرِ وطن‘‘ سے آغاز پارہا ہے، جس میں وطنی شاعری کی گوناگوں اہمیت دکھاتے ہوئے ’’ذکرِ وطن اور اردو شاعری‘‘ کا موضوع مشاہیر شعرائے اردو کے کلام سے مرصع ومبرہن کیا گیا ہے اور ’’جمیلؔ مظہری کی دو وطنی نظمیں: ایک تجزیہ‘‘ کے عنوان سے ’’بھارت ماتا‘‘ اور ’’اے مادرِ ہندوستاں‘‘ پر تنقیدی اقتباسات اور تجزیاتی نکات کے ساتھ اظہارِ خیال کے بعد ’’اے زمینِ وطن‘‘، ’’سرزمینِ ہند‘‘ اور ’’عظمتِ ہندوستاں‘‘ کے عناوین سے شاعری کی زبان میں وطن کے نغمے لکھے گئے ہیں۔

اس افتتاحی حصہ کے بعد ’’مقالات‘‘ کے ذیل میں ایک طرف جامع اور وقیع تمہید کے ساتھ ’’عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری‘‘ کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے اور ارضِ بہار سے وطنی تعلق رکھنے والے، امریکہ میں سکونت پذیر ’’ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری‘‘ پر اُن کے مجموعہ کلام کی روشنی میں باتیں ہوئی ہیں تو دوسری طرف ایرانی محقق ’’ذبیح اللہ صفا کی بیدلؔ شناسی‘‘ بھی تمام تر مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ بہ صورتِ ترجمہ بخوبی سامنے لادی گئی ہے اور پھر حالیؔ کے لئے لفظ ’’باوا‘‘ کے استعمال پر اپنی پسندیدگی کی وجہ بتاتے ہوئے اور مرقدِ حالی پر حاضری اور وہاں کے مشاہدات قلم بند کرتے ہوئے بجا طور پر مسدس کے اس عظیم فن کار کو حب الوطنی وقومی یک جہتی کا پیامبر کہا گیا ہے۔

بعد ازیں ’’یادیں‘‘ کے تحت ہمارے قلم کاروں کے ذریعہ راشد انور راشد، بدناؔم نظر اور ظفؔر رانی پوری کی حیات وخدمات کا تذکرہ اپنے اپنے انداز میں اور اپنے اپنے دیرینہ مراسم وملاقات کے حوالے سے نہایت دلسوزی کے ساتھ سپردِ قرطاس ہوا ہے۔

اس شمارے کے ’’افسانے‘‘ کی شروعات ’’بوجھ‘‘ سے ہوئی ہے، اگر چہ یہ بظاہر محبت میں فریب کی عام سی کہانی ہے، لیکن اس میں نفسیاتی وسماجی سفاکیوں کے اشارے اور فطری جنسی ایمائیت بھی پنہاں نہیں رہتی اور یہ نکتہ بھی کہ مرد وزن کے اختلاط کی کھلی چھوٹ خواہ کسی طرف سے اور کسی وجہ سے ہو، وہ بوجھ ہلکا نہیں کرتی بلکہ سدا کے لئے بوجھ ڈال جاتی ہے، پھر انتہائی پسماندہ طبقہ کے استحصال کی کہانی ’’رنگ‘‘ میں جنسی تشنگی اور رومانی یادیں ہی نہیں دیکھی جاسکتیں بلکہ یہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ یہ طبقہ مردوں کے ذریعہ ہی نہیں عورتوں کے ذریعہ بھی کس کس طرح استحصال کا شکار ہوتا ہے اور اس کا رنگ کیسے سامنے آتا ہے۔ یہاں کوئیلری کی کہانی ’’ماں کا شکم‘‘ صرف اُس دنیا کی معلومات اور وہاں کے مزدوروں کی زندگی ہی نہیں دکھاتی بلکہ انوراگ کی دادی کے اس قول کو کہ کوئلے کی کان میں جانا گویا ’’روز روز ماں کے پیٹ میں جانا‘‘ ہے، انوراگ کی ماں کے حوالے سے یک گونہ واقعاتی سطح پر بھی لادیتی ہے۔

امید قوی ہے کہ مذکورہ مشمولات کے ساتھ ساتھ ’لیٹ‘ کے عنوان سے آراستہ ’’طنز ومزاح‘‘ کی شگفتہ بیانی، اس کا اصلاحی مقصد اور اس کا آخری نہایت پرلطف حصہ بھی پسند آئے گا۔ ’’منظومات‘‘ کے اوراق بھی مطبوعِ خاطر ہوں گے، ’’کتابوں کی دنیا‘‘ بھی تشویقِ مطالعہ میں کامیاب رہے گی اور ’’بچوں کا زبان وادب‘‘ بھی انہیں اپنی نثری اور شعری سوغات سے خوش داماں بنائے گا۔ زیادہ، آزادیٔ وطن کی تہنیت کے ساتھ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

ذکرِ وطن

ڈاکٹر نشاط اختر
Bhagwanpur, Vaishali- 844114 (Bihar)

ذکر وطن اور اردو شاعری

ادب وشاعری میں ترجیحی طور پر موضوع اہم ہے یا اسلوب یا مساوی طور پر یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم ہیں؟ ان سوالوں پر بحث و مباحثہ کی چاہے کتنی ہی گنجائش ہو اور نوع بنوع اخذ نتائج کے کتنے ہی امکانات، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ وطن کا ذکر ادب وشاعری کے جزو اعظم ہی نہیں جزو اکرم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ وطن سے محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے اور جو کچھ سرشت انسانی کا حصہ ہو، اس کے بیان و اظہار سے بہرصورت مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ وطن کو ماں کا درجہ حاصل ہے اور ماں کو کبھی کوئی بھی شخص کسی بھی حال میں بھلا ہی نہیں سکتا ہے۔

''وطن'' کا لفظ ہماری زبان میں عربی سے آیا ہے، جس کے معنی ہیں ''اپنا دیس، پیدائش کی جگہ'' اور ''وطنیت'' کی اصطلاح کا مطلب ہے وطن پرستی کا جذبہ، اسی جذبے کے طفیل وطن کے لئے ''وطن مالوف'' کی ترکیب استعمال ہوتی ہے یعنی وطن عزیز، پیارا وطن اور اس میں کیا شک کہ یہ ایک ایسا محترم اور محبوب موضوع ہے جس سے عالمی ادب و شاعری کے فنکاروں نے ہمیشہ ہی کسی نہ کسی انداز میں اپنا شغف برقرار رکھا ہے اور نہ صرف ادب اطفال میں تعلیم وتربیت اور ذہن سازی کے مقاصد سے اس موضوع پر مضامین، کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں بلکہ بڑوں کے ادب میں بھی زندگی اور زمانے کے تقاضوں کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے حسب حالات اسے پورے شعور و ادراک اور فکری وفنی گیرائی و گہرائی کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے تاکہ وطن سے محبت کا جذبہ اور اس کی عظمت کا احساس ہمیشہ تر وتازہ رہے اور وطن کی ہمہ جہت ترقی وخوش حالی کے کاموں سے اہل وطن کبھی غافل نہ ہوں اور وطن کی خدمت و حفاظت کے لئے ہر قیمت پر ہمہ دم تیار رہیں۔

وطن سے محبت کو جزو ایمان بتایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ حب الوطنی میں کمی گویا ایمان وعقیدے میں کمی کے مصداق ہے۔ اس سلسلہ کی بہت ساری تفصیلوں سے قطع نظر، جہاں تک اردو ادب اور اردو شاعری کا تعلق ہے، ہمیں یہ دیکھ کر یقینی طور پر فخر وانبساط کا احساس ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی اس زبان کے ادبی فن کاروں نے اپنی نگارشات میں وطن کی الفت وعظمت کے حقیقت پسندانہ اور نہایت عقیدت مندانہ تذکرے کئے ہیں اور وطن کے نغمات سے خصوصیت کے ساتھ اپنی شاعری کو سجایا ہے۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وطنی شاعری اپنے موضوعی تقدس کے ساتھ اپنا ایک خاص مزاج و ماحول اور وقار رکھتی ہے اور وطن کی رنگارنگی اس میں بوقلمونیت کی وہ عجیب وغریب شان پیدا کر دیتی ہے جو دیگر موضوعاتی شاعری میں بہ مشکل تمام ہی ملتی ہے۔

وطنی شاعری داخلی بھی ہے، خارجی بھی اور اس کا رشتہ بزم سے بھی ہے اور رزم سے بھی۔ اس نوعیت کی شاعری میں صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کے شاندار و جاندار اشارے بھی ملتے ہیں اور عظیم المرتبت شخصیات کے ناقابل فراموش کارناموں کی یادیں اور ان کے تعلق سے دائمی ممنونیت کے جذبات بھی۔ یہاں زبان وعقائد اور رسوم ورواج کا بیان بھی ہوتا ہے اور جغرافیائی خصوصیات کا ذکر بھی، مزید یہ کہ وطنی شاعری میں عقیدے اور عقیدت کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ یہ وقت وحالات کے تحت رجز گوئی کے دائرے میں بھی آتی ہے اور نغمہ سرائی کے دائرے میں بھی۔ اس طرح یہ کبھی حد درجہ طنطنہ، بلند آہنگی اور متواتر للکار کی مثالیں پیش کرتی ہے تو کبھی سرتاپا مترنم انداز میں محبت کی پکار بھی بن جاتی ہے۔

وطنی شاعری کا یہ بنیادی اور دائمی وظیفہ ہے کہ وہ وطن سے محبت کا تصور ارضی حقیقت اور سرتاسر معقولیت کی شکل میں سامنے لاتی ہے۔ یہ اپنوں کے خوابیدہ جذبات جگاتی ہے، انہیں حوصلہ دیتی ہے،

احوال زمانہ سے ہوشیار کرتی ہے اور غیروں کو اپنا معتقد بناتی ہے یا پھر اپنے اظہارِعزم سے ملک وقوم کے بدخواہوں کا حوصلہ پست کرتی ہے اور انہیں اُن کی بدنیتی کے یقینی خمیازے اور ہزیمت سے آگہی دیتی ہے۔اعتراف وتشکر پسندی، غیرت دہی اور عزیمت پسندی کے ساتھ ساتھ عصری حسیت، زمانہ شناسی اور شخصیت پسندی کے جس قدر وافر عناصر وطنی شاعری میں بالکل فطری انداز سے شمولیت پالیتے ہیں اور جس طرح یہاں جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات اور محاکات و مناظر کے عکوس ونقوش ملتے ہیں اور جس حد تک طبائع پسند مخلصانہ و برادرانہ پند ونصیحت کے لئے گنجائشیں ہوتی ہیں اور ذہن ساز پیامی وطیرے کے ساتھ ادیب و شاعران سے کام بھی لیتا ہے، وہ شاید کسی دوسری نوعیت کی شاعری میں مشہود نہیں۔

یہ وطنی شاعری ہی کا مرتبہ ہے کہ وہ امن وترقیات اور دفاع و تحفظ کی خاطر جنگ ونبرد آزمائی دونوں ہی حوالے سے کامیاب وموثر انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ وطنی شاعری اصل میں ایک بہت بڑی طاقت کا نام ہے اور اگر یہ لکھا جائے تو یقیناً کسی کو اعتراض نہیں ہوگا کہ اردو میں وطنی شاعری کا سرمایہ مذکورہ سبھی اوصاف کا حامل ہے۔

وطنی شاعری کو اگر متنوع علوم وفنون کے مطالعہ کا ایک بہت ہی خاص نچوڑ یا ''عطر مجموعہ'' کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس نوعیت کی کاوشوں سے ہماری اردو شاعری میں نہ صرف تاریخ و جغرافیہ کے اَن گنت علاقائی نام اور علمی وفنی اصطلاحوں نے جگہ پایا ہے بلکہ عرفان وتصوف اور ''جویات وبحریات'' کی بہت ساری اصطلاحیں بھی جمع ہوگئی ہیں۔ ذکر وطن کی بدولت اردو شاعری میں بہت سارے لفظوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کی فرہنگ حد درجہ ثروت مند بنی ہے اور اس کے آہنگ کو خاص وسعت اور بوقلمونیت ملی ہے۔

اگر چہ یہ صحیح ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری بھی ذکر وطن سے خالی نہیں ہے۔ اس میں بھی بسا اوقات اس موضوع کے خوبصورت اور اپنی طرف متوجہ کر لینے والے اشعار مل جاتے ہیں، لیکن نوعِ غزل چونکہ مزاجاً کسی نہ کسی حد تک انتشار اور ریزہ خیالی سے قریب ہے اور ذکر وطن کا موضوع مزاجاً ارتکاز وتسلسل چاہتا ہے، اس لئے اس موضوع پر لکھنے والے شاعروں نے مثنوی، رباعی، قطعہ اور خصوصاً نظم ہی کی صورت میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور نظم کی مختلف ہیئت مثلاً مسدس، مخمس، مثلث، ترکیب بند وترجیع بند سے ترجیحی طور پر کام لیا ہے، تاکہ تکرار مصارع سے حسب مقصد زیادہ فائدہ مل سکے اور اصل بات پڑھنے والوں کے ذہن پر جلد سے جلد اثر انداز ہوسکے اور ان کے دل ودماغ میں محفوظ رہ سکے۔ مزید یہ کہ اس طرح بربطی کیفیات بھی بیش از بیش ابھر سکیں۔ وطنی شاعری میں تخاطب پسندی بھی اسی نفسیاتی فائدے کی خاطر عام ہے۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے شاید ایک اور پہلو کی طرف اشارہ بھی غیر ضروری نہ ہوگا کہ وطنی شاعری موضوع کے لحاظ سے اخلاقی شاعری ہے اور اس کا مقصد وطن سے محبت کا جذبہ جگاتے رہنا ہے، لیکن حالات کے تحت یہی شاعری اُس وقت سیاسی وانقلابی اور خاص عمرانی و

(۱)خطِ مَعقلی (۲) کوفی بہ دورِ عروج (۳)کوفی مزیّن (۴)کوفی (۵)ثلث (۶)نسخ (۷)رقعہ بہ قلم انیس صدیقی بہ شکریہ اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اوّل

پیامی شاعری بھی بن جاتی ہے، جب قومیں تاریخ کے کسی جبر سے گزرتی ہیں اور اس سے نجات چاہتی ہیں یا کسی خاص رُخ سے انہیں معاشرے میں کوئی خاص اصلاح مطلوب ہوتی ہے اور وہ جلد سے جلد اس کے حصول کی طلبگار ہوتی ہیں۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان میں وطنی شاعری کا جو شاندار سرمایہ ملتا ہے، وہ دراصل دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں ایک طرف وہ شاعری ہے جس کی حیثیت صرف وطن کے قصیدے کی ہے اور دوسری طرف وہ شاعری جو آزادی وطن کی طلب اور اس کے لئے رجز و پیکار سے عبارت ہے۔

اردو شاعری میں ذکر وطن بجائے خود ایک ایسا موضوع ہے کہ اس حوالے سے وطن عزیز ہندوستان کے بارے میں کہی گئی مثنویوں، نظموں اور رباعیات وقطعات کا احاطہ ہو ہی نہیں سکتا۔دیگر اصناف سے قطع نظر اگر صرف اس موضوع کی نظمیں ہی جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر بنتے جائیں گے اور سب کچھ یکجا کر لینے کا کوئی حتمی دعویٰ ممکن نہ ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے اور ایسے کسی پشتارہ شاعری سے کچھ حاصل بھی نہیں، بلکہ اصل چیز اس کی روایت اور روح کو سمجھنا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم سب ہندوستانی ہیں اور ہمارے لئے ہندوستان کا ذکر ہی وطن کا ذکر ہے۔اقبالؔ کے لفظوں میں ع

''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا''

اردو شعر وادب کی تاریخ پڑھنے والے ''دکنی مثنویات میں ہندوستانی عناصر'' جیسے موضوع اور اس کے مواد سے بخوبی واقف ہیں۔طبعیؔ کی مثنوی ''بہرام وگل اندام'' کا ایک شعر ہے ۔

جس کوں یاد کرتا نئیں اپنا وطن
او مردا ہے پیرن ہے اس کا کفن

اور یہ شعر بتا رہا ہے کہ ذکر وطن کی اہمیت، اس کی لزومیت اور اس کی ضرورت وافادیت کا احساس قدیم اردو کے دور سے ہی ہمارے شاعروں کے یہاں موجود تھا اور وہ ذکر وطن کو نشان حیات سمجھتے تھے۔گویا وطن اور وطن کا قصیدہ شاعر اور شاعری کے لئے بہ منزلۂ حیات تھا اور سچ پوچھا جائے تو روز اوّل سے ذکر وطن اور شاعری وادب کا رشتہ یہی ہے۔اگر ہم بہ غرض اختصار دکنی دور ہی کیا، اس کے بعد شمالی ہند میں انگریزوں کی آمد اور فرنگی حکومت کے استحکام تک اس موضوع کے تحت جو شاعری ہوئی، اُسے فی الوقت یہاں تذکرے میں نہ لائیں، تب بھی اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں اور شاید یہی کافی بھی ہے کہ ''وطنی قصائد'' کی صدیوں پر پھیلی ہوئی اس روایت کے بعد اردو میں نئے احوال سیاست کے زیر اثر ہندوستان کو یاد کرنے کا واضح سلسلہ علامہ اقبالؔ کے شہرۂ آفاق ''ترانۂ ہند'' سے آغاز پایا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یہ اشعار صرف اس بات پر گواہی نہیں دے رہے ہیں کہ شاعر نے یہاں ایسے الفاظ وتراکیب کو پالیا ہے جو اپنے مفاہیم کی ترسیل وابلاغ کے بعد

(۸)خطِ دیوانی (۹) شکستہ (۱۰)نستعلیق (۱۱)گلزار (۱۲)غبار
به قلم انیس صدیقی به شکریه اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اوّل

بھی از کار رفتہ نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس بات کی بھی شہادت دے رہے ہیں کہ ذکر وطن سے متعلق شاعری میں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے ذہن ساز پیغام نے اصل مقصدیت کا درجہ پالیا ہے اور وطنی شاعری کی روح کے مصداق بن چکا ہے۔ یہ اصل میں سچی زمانہ شناسی ہے جو وطنی شاعری کے تعلق سے اقبالؔ اور اُن کے معاصرین اور معاً بعد آنے والے شاعروں کے حصہ میں آئی۔ اس حوالہ سے ظفر علی خاں، درگا سہائے سرورؔ جہاں آبادی اور چکبستؔ کے یہ اشعار بھی دیکھئے۔ نظم ''ہندوستان'' میں ظفر علی خاں کا مطلع ہے ۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

پھر ''گلزار وطن'' سے سرورؔ کی صدائیں گونج رہی ہیں ۔

مل جل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے، گیت اس چمن کے گائیں

اور ''خاک ہند'' کا شاعر کہہ رہا ہے ۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

غلام ہندوستان کی صبح وشام میں ایک طرف مہاراج بہادر برقؔ دہلوی ''اہل ہند'' کو یہ کہہ کر نئے حوصلے دلا رہے ہیں کہ ۔

انقلاب دہر سے سب شان والے مٹ گئے
روم والے مٹ گئے، یونان والے مٹ گئے
سیریا والے مٹے، توران والے مٹ گئے
کون کہتا ہے کہ ہندوستان والے مٹ گئے
نقش باطل ہم نہیں جس کو مٹائے آسماں
ہم نہیں مٹنے کے جب تک ہے بنائے آسماں

تو دوسری طرف اکبرآباد کا شاعر سیمابؔ دنیا کے سامنے اپنے وطن سے تخاطب کے ساتھ یہ اعلان کررہا ہے کہ ''ہندوستاں'' میں ۔

اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب
تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب

وطن عزیز کی عظمت ومحبت کا ترانہ گانے والوں میں جوشؔ ملیح آبادی بھی ہیں اور آنند نرائن ملا، جاں نثار اخترؔ، اعجاز صدیقی اور جمیلؔ مظہری جیسے شعرا بھی۔ جوشؔ کی شاعری اپنے گھن گرج والے رویے سے چاہے کتنی ہی معتوب نظر ہوا اور بعض پہلو سے اس موضوع پر ان کا کلام کتنا ہی قابل اعتراض کیوں نہ ٹھہرا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظم ''وطن'' میں ہندوستان کو ''روح روانِ احرار'' کہتے ہوئے کچھ الگ ہی انداز سے یاد کیا ہے، آیئے اس نظم کے یہ اشعار دیکھیں ۔

اے وطن پاک وطن روح روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگ بہار

ہندوستاں ہمارا مہکا ہوا چمن ہے
ہر اک قدم پہ اس کے پھولوں کی انجمن ہے
خوشبو کی وادیوں میں لپٹا ہوا وطن ہے
دشمن کے حق میں خنجر، اپنوں کو یہ چبھن ہے
ہندوستاں ہمارا مہکا ہوا چمن ہے
آکاش سے حسیں تر دھرتی کا پیرہن ہے
میرے وطن کے رُخ پر دلہن سا بانکپن ہے
ہندوستاں ہمارا مہکا ہوا چمن ہے

—— منیرؔالزماں

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی
بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری
حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو
تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو

باطل کبھی تنویر حق کی تاب لا سکتا نہیں
شمع جلال حریت کوئی بجھا سکتا نہیں
کوئی بھی اب تجھ کو غلامستان بنا سکتا نہیں
ہے ذرّے ذرّے کی نظر میں خونِ آزادی رواں
اے کشورِ ہندوستاں اونچا رہے تیرا نشاں

—— روشؔ صدیقی

شیدا ہوں آزادی کا آزاد نگر میں ڈیرا ہے
کیا بتلاؤں میرے بھیا، کون جہاں میں میرا ہے
وہ میرا جو آزادی کی زلفوں کا دیوانہ ہے
وہ میرا جو شمع وطن کا شیدائی پروانہ ہے

—— انورؔ صابری

تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو
تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو
تجھ سے منھ موڑ کے منھ اپنا دکھائیں گے کہاں
تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائیں گے کہاں
اے وطن پاک وطن روح روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگ بہار

آنند نرائن ملا کی خوبصورت نظم ''زمین وطن''، مخمس کے فورم میں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ آنند نرائن ملا نے بھی اس نظم کے چوتھے بند میں اپنے وطن عزیز کو اسی حوالے سے یاد کیا ہے جو حوالہ ابھی جوشؔ کی نظم میں گزرا یعنی بچپن کا حوالہ۔

جہاں ابن آدم پلا گودیوں
جہاں نسل انساں چلی گھٹنیوں
جہاں چشم حیرت کے ''کیا'' اور ''کیوں''
لب طفل تک آئے بن کر سخن
زمین وطن اے زمین وطن

یہ یک طویل نظم ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس کے چند بند اور بھی برسبیل تذکرہ یہاں نقل کئے جائیں۔

ترے کوہ دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشک خلد بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمین وطن ، اے زمین وطن

تجھے صولت بابری کی قسم
تجھے عصمت پدمنی کی قسم
تجھے خاک پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلال کہن
زمین وطن ، اے زمین وطن

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساوات انساں کا پھر نام لے

روایات ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمین وطن ، اے زمین وطن

جاں نثار اختر کی شاعری کا اپنا خاص مزاج ہے جو رومانیت سے نہایت قریبی رشتہ رکھتا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے وطن کا قصیدہ پڑھتے ہوئے بھی اپنے اس خاص مزاج کی رعایت کے ساتھ ''بادۂ وطن'' کی پیش کش کی ہے اور ساقی نامہ کے انداز میں کہا ہے ۔

پلا ساقیا بادۂ خانہ ساز
کہ ہندوستاں پر رہے ہم کو ناز
محبت ہے خاک وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
سلامت رہیں اپنے دشت و دمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلف گنگ و جمن
رہیں مسکراتی حسیں وادیاں
رہیں شاد جنگل کی شہزادیاں
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں

جب کہ اعجاز صدیقی نے ''نغمہ وطن'' میں ارض ہند کے لئے اپنی فدویت کے جذبوں کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔

مسکراتی تیری ندیاں ، گنگناتے آبشار
لہلہاتے کھیت تیرے ، نکہت آگیں لالہ زار
تجھ پہ قرباں میری ہستی ، تجھ پہ جان و دل نثار
میرے سینے میں رہے ہر وقت تیری ہی لگن
اے وطن ، میرے وطن ، اچھے وطن پیارے وطن

وطنی شاعری کے باب میں علامہ جمیل مظہری کی نظمیں بھی نہایت خوبصورت اور بامعنی ہیں۔ ایک طرف تو ان کی نظم ''بھارت ماتا'' میں ایک خاص انداز اپنایا گیا ہے ۔

او ماتا ، او بھارت ماتا
تجھ پر خدا کی رحمت ماتا

اور دوسری طرف نظم ''اے مادر ہندوستاں'' کی شروعات یوں ہوتی ہے ۔

ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں
تیری زمیں رشک فلک ، تیرا چمن رشک جناں

اس نظم میں انہوں نے قومی و مذہبی اتحاد و یگانگت کو وطن کا محکم نشاں بتایا ہے اور کہا ہے کہ ۔

ہم صوت ، ہم آہنگ ہیں صدیوں سے ناقوس و اذاں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں
سوز اخوت کی لہک ہر شہر میں ، ہر گاؤں میں
جملہ مذاہب دہر کے سرسبز تیری چھاؤں میں
تو نے تمام ادیان کو موقع دیا تلقین کا
پرتھی کے راج استھان میں روضہ معین الدین کا
تیری رواداری کا ہے پائندہ و محکم نشاں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں

بلاشبہ اردو شاعری میں ذکر وطن کا ایک انوکھا جہاں آباد ہے، مثلاً نہال سیوہاروی نے از راہِ عقیدت یہ تعلیم دی ہے کہ ۔

وطن کا چاند وطن کے نجوم اچھے ہیں
وطن کے پھولوں کو دل بھر کے چوم، اچھے ہیں

تو ''ترانہ وطن'' میں ساغر نظامی نے اپنے بے پناہ اور پرخلوص عزم وایثار کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے ۔

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من
عظمت زندگی کی قسم ہے ہمیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دیں گے ہم
وقت آنے دے اے ماں ترے نام پر
اپنی ہستی و مستی مٹا دیں گے ہم
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن
تجھ پہ قرباں زر و مال اور جان و تن

اشترا کی شاعر کی حیثیت سے علی سردار جعفری کا نام مشہور زمانہ ہے۔ ان کی نظر میں ''یہ ہندوستان'' کیا ہے؟ اس کا جواب خود اُنہیں کی زبانی سنئے ۔

یہ ہندوستاں رشک خلد بریں
اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں
ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں
یہ گنگا کا آنچل ، یہ جمنا کی ریت
یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت
مگر یہ خزانے ہمارے نہیں
ہمارے نہیں ہیں تمہارے نہیں

ذکر وطن کے تعلق سے اس نظم کا ایک ایک شعر جہاں صنائع و بدائع کا حسین وجمیل نمونہ پیش کرتا ہے، وہیں اس سے یہ ذہن بھی ملتا ہے کہ وطن کا ذکر کرتے ہوئے بہرکیف فنکاروں کے ذہن میں عہد محکومیت کی بے بسی بھی رہی ہے، یا پھر اشترا کیت کے اُس فلسفہ اور مطالبہ کا اثر بھی جو مزدوروں اور کامگاروں کا لازمی اور مساوی حق چاہتا ہے۔

اسی طرح ''ہندوستان'' کے عنوان سے مہدی نظمی نے وطن عزیز کی جو منظوم تاریخ لکھی ہے اس کا تذکرہ بھی یقیناً یہاں مفید موضوع ہوگا جس میں ''آغاز تمدن'' اور ''اسلامی دور'' سے لے کر متعدد ذیلی عناوین کے ساتھ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' اور پھر ''آزادی کی تحریکات'' تک بات پہنچی ہے۔ شاعر نے جہاں اُس عہد کو یاد کیا ہے جب کہ آزادی کے دیوانے زنداں کی سلاخوں کے پیچھے ڈالے جارہے تھے، وہیں ''جذبات وطن'' کا فیضان بھی دکھایا ہے اور حصول آزادی کو اللہ کا کرم بتاتے ہوئے اظہار رجائیت کے ساتھ نظم کا اختتام کیا ہے ۔

وہ ترنگا ، رنگ جس کے سبز اور زرد و سپید
وہ نشان حوصلہ ، وہ نقش ارمان و امید
جس کا چرخہ محنت و جہد مسلسل کی نوید
جس کو لہرانے پہ ہوتے تھے وطن کے لوگ قید
دل سے جوڑا تھا جذبات وطن نے ساتھ ساتھ
جس کی چھڑ تھامی تھی شیخ و برہمن نے ساتھ ساتھ

میرے رب نے پھر دیا میرے وطن کا مجھ کو راج
فخر کا میری جبیں پہ رکھ دیا خالق نے تاج
ارتقا کے راستے پر پھر چلا میرا سماج
مٹی پھر اُگلے گی سونا، کھیت پھر دیں گے اناج
میری محنت سے مری تقدیر بنتی جائے گی
خط اُبھرتے جائیں گے تصویر بنتی جائے گی

ذکر وطن اور اردو شاعری پر لکھتے ہوئے طپش صدیقی کی ''حدیث وطن'' اگر ہمیں اپنی دھرتی کو اپنی حیات و کائنات بتاتی ہے اور ۔

مرا وطن مرا وطن ، حیات و کائنات من
مرے وطن کی سرزمیں، جمیل و دلکش و حسیں
مرے وطن کا آسماں عظیم و عزم آفریں
یہ پر خلوص بستیاں فلاح و خیر کی امیں
سکوں پسند و صلح جو ، بلند ظرف و پاک بیں
مرا وطن ، مرا وطن ، حیات و کائنات من

جیسے خوبصورت افتتاحی بند کے ساتھ یاد آتی ہے تو افسر میرٹھی کے قلم سے ''وطن کا راگ'' بھی ہمیں ایک بار پھر یہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے کہ قومی یکجہتی کا درس ہی فی الواقعہ ذکر وطن اور اردو شاعری کے رشتہ کی اصل روح ہے۔ ''ترانۂ ہند'' میں علامہ اقبال نے جو لے اُٹھائی تھی، اُسی کی بازگشت افسر کے ان اشعار تک بھی پہنچی ہے ۔

مذہب کچھ ہو، ہندی ہیں ہم، سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے، پریم کے ہم شیدائی ہیں
بھارت نام کے عاشق ہیں ہم، بھارت کے سودائی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا، سب دیشوں سے پیارا ہے

اور یقیناً اس مضمون کے حق میں بھی اس مصرع سے انسب خیر ختام کچھ اورنہیں ہوسکتا کہ ع

بھارت پیارا دیش ہمارا، سب دیشوں سے پیارا ہے

❀❀❀

نجم الزماں
Chandwara, Muzaffarpur- 842002

جمیلؔ مظہری کی دو وطنی نظمیں: ایک تجزیہ

بیسویں صدی کے حوالے سے اردو شاعری کی تاریخ میں علامہ جمیلؔ مظہری کا نام و مقام کسی رسمی تعارف کا دست نگر نہیں۔ وہ یقیناً اپنے وقت کے بہت ہی ممتاز و منفرد اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے اپنی خاص شہرت و شناخت رکھتے ہیں، جس کا زمانہ کل بھی معترف تھا اور آج بھی معترف ہے۔ علامہ جمیلؔ مظہری کی سخنوری کا اصل شہرہ اگرچہ ان کی غزل گوئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اردو مثنوی کی تاریخ نہ تو ان کے ''آب و سراب'' سے صرف نظر کر کے انصاف کا ثبوت دے سکتی ہے، نہ ہی ان کی رثائی شاعری کے طرز و انداز کی مزیات بھلائی جاسکتی ہیں اور نہ ہی ''نقش جمیلؔ'' کے امتیازی خدوخال سے نگاہیں ہٹائی جاسکتی ہیں۔ بیشک جمیلؔ مظہری ہمارے اُن فنکاروں میں ہیں جنھوں نے تمام اصناف سخن کی آبیاری کی ہے۔

علامہ جمیلؔ مظہری کی نظمیہ شاعری میں ایک طرف عشق و رومان کو موضوع بنایا گیا ہے تو دوسری طرف اس میں وطن کی عظمتوں کے وافر تذکرے بھی موجود ہیں اور اس حوالے سے ان کی دو نظمیں یقیناً بہت ہی خاص ہیں۔ ان میں ایک نظم ''بھارت ماتا'' ہے اور دوسری نظم ''اے مادرِ ہندوستاں''۔ اوّل الذکر نظم پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے تاثرات اور تجزیاتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یقیناً بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''بیسویں صدی کے سیاسی و عمرانی مسائل، وطن کی محبت، آزادی کی جدوجہد، سرمایہ دارانہ استحصال اور دور حاضر کی کشمکش کو جمیلؔ مظہری نے بھی (اگرچہ) اپنے فن کا محور بنایا ہے، لیکن اپنے بیدار شعور، ضبط و توازن، سنبھلی ہوئی طبیعت اور فنی چابک دستی کی بنا پر وہ افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے ہیں، اسی لئے آج بھی ان کی نظموں میں تازگی و دلکشی اور ادبی حسن ہے۔ ان کی انقلابی اور سیاسی نظموں میں ایک ترقی پسند نقطہ نظر اور تعمیری زاویہ نگاہ ملتا ہے۔ ان کی آواز میں جوشؔ کا کھردرا پن، کرختگی اور پھٹے ہوئے بانس کا انداز نہیں ہے۔ ان کے شعری سرمایہ میں 'پیس ڈالوں گا، رگڑ دوں گا، چبا ڈالوں گا میں' یا 'دب کے بھیجے سے نکل جائے گا شاہی کا غرور' جیسی بے لگام چیزیں نہیں ملیں گی۔ انہوں نے 'اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ' یا 'نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں' کا آوازہ کبھی پسند نہیں کیا۔ ان کے نغموں میں مادر وطن کا احترام بھی ہے اور غلامی کا کرب بھی، اسی لئے ان کی آواز میں رس اور ان کے نغموں میں ایسا گداز ہے جو پڑھنے والے پر ایک خوشگوار اور دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

جوشؔ نے اپنے وطن سے اس طرح خطاب کیا ہے ۔

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدنما
اے جبین ارض کے داغ اے دنی ہندوستاں

لیکن جمیلؔ مظہری نے بھارت ماتا کے چرنوں میں اپنے دل کی بھینٹ یوں چڑھائی ہے ۔

او ماتا، او بھارت ماتا
تجھ پر خدا کی رحمت ماتا
سندر تو، ہریالی تو ہے
دھانی آنچل والی تو ہے
جگ دیتا ہے تجھ کو دعائیں
ہم ترا گن کس طرح نہ گائیں

پھر غلامی کی داستان کو عجیب درد انگیز اور بہت ہی موثر پیرائے میں چھیڑا ہے ۔

آنچل میں تیرے ہن برسیں
اور ترے بچے ان کو ترسیں

اور پھر ماتا کے سارے سپوتوں کے ساتھ مل کر جمیلؔ مظہری نے اس کے دکھیا دل پر مرہم رکھا ہے ۔

آ ہم تیرے بال سنواریں
تجھ پر اپنی جانیں واریں
مت رو اے دکھیاری ماتا
پیاری ماتا ، پیاری ماتا

ہند کے یہ غلام جمیلؔ مظہری کے یہاں 'روسیاہ' نہیں ہیں۔ یہ اپنی ماں سے آشیرواد لے کر آزادی کی لڑائی پر جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں ماں کی ممتا نے بہت سے چراغ جلائے ہیں ۔

او ماتا گوتم کی ماتا
ارجن اور بھیشم کی ماتا

یہی ایک نظم جوشؔ اور اس قبیل کے دوسرے شعرا کی نام نہاد انقلابی شاعری کے پورے سرمائے پر بھاری ہے۔''

(اقتباس منقول از سوویز جشن جمیلؔ مظہری ۱۹۷۵ء)

یہ اقتباس اگر چہ خاصا طویل ہے اور از روئے اصول اس کی شمولیت کچھ خلاف قاعدہ بھی، لیکن میں نے یہاں اس امر کا احساس رکھتے ہوئے بھی اسے نقل کرنے کی قصداً جسارت کی ہے، محض اس لئے نہیں کہ یہ اقتباس خلیل الرحمٰن اعظمی کے قلم سے ہے اور نہ ہی اس لئے کہ اس سے مضمون کے ذرا طویل ہو جانے کا فائدہ مل رہا ہے، بلکہ اس لئے کہ اس سے جمیلؔ کے عہد میں اردو کی وطنی شاعری کا پورا مزاج و ماحول بھی آئینہ ہو رہا ہے۔

بلاشبہ اس نظم میں علامہ نے وطن کی آب و ہوا، اس کے پھل پھول، اس کے بحر و بن اور اس کے قدرتی مناظر کی جو عکاسی کی ہے، پھر عہد استعماریت کے حوالے سے، خاص پیکر تراشی کے انداز میں وطن کی بے بسی کا جو نقشہ کھینچا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ رجائیت و عزیمت کی جو فضا بندی کی ہے اور تاریخ کے جو حوالے لئے ہیں، وہ بے مثل ہیں اور فدویت کے جذبات کی زیریں لہریں پوری نظم میں رواں دواں ہیں۔

جمیلؔ مظہری کی یہ نظم ان کی قادرالکلامی، وطن کے حالات سے واقفیت اور اس کے لئے دلی جذبات محبت کے والہانہ اظہار پر شاہد عدل ہے۔ اس میں حالیؔ کی شرافت و دردمندی کا پرتو بھی ہے اور اقبالؔ کا رچا ہوا شعور بھی، پھر یہ کہ علامہ کی اس وطنی نظم میں جو سادگی و شیرینی ہے اور ہندی لفظوں کا جو حسن استعمال ہے، وہ بھی بہر صورت دیدنی ہے۔

اب آیئے، علامہ جمیلؔ مظہری کی دوسری نظم ''اے مادرِ ہندستاں'' کی طرف۔ علامہ کی یہ نظم مسدس کے فارم میں آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں جہاں شاعر نے نانک، اکبر، ٹیگور اور باپو کا ذکر کیا ہے، وہیں دوسرے بند میں گنگا ندی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس سے راست تخاطب کے ساتھ کہا ہے کہ ع

اے مادر گنگا ترا ہر بلبلہ طوفاں لئے

گویا ان ابتدائی دو بندوں میں تاریخ کے پہلو سے بھی ہندوستان کی عظمت دکھائی گئی ہے اور جغرافیہ کے حوالے سے بھی۔ یہاں مناسباتِ لفظی اور ''قلزم رحمت'' جیسی خوبصورت ترکیبوں کا استعمال بھی دیدنی ہے۔ علامہ کی اس نظم کا پہلا شعر ہے ۔

ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں
تیری زمیں رشک فلک ، تیرا چمن رشک جناں

پھر اس میں شاعر نے سائنسی معلومات اور طبعی جغرافیائی نظام سے نہایت لطافت کے ساتھ استفادہ کیا ہے اور بالواسطہ طریقہ سے یہ دکھانا چاہا ہے کہ جس طرح آندھی آتی ہے، بادل اُٹھتا ہے اور پھر بوندیں زمین پر آتی ہیں گویا اُسی طرح ''عرفاں کا اک بادل بنا'' اور ''مادر گنگا'' کی شکل میں اپنے ''قطرۂ روشن'' سے اک ''قلزم رحمت'' بنا گیا ۔

اے ارض پاک ہند ہم تیری کہانی کیا کہیں
اک قلزم رحمت ہے تو ، تیری روانی کیا کہیں
ہر موج اک تاریخ ہے ، ہر لہر ہے اک داستاں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں

اس کے بعد شاعر نے اس نظم کے اگلے بند میں وطن عزیز کے اُس وصف خاص کی طرف اپنے بیان کا رُخ نہایت خوبصورتی سے موڑ دیا ہے جسے ''کثرت میں وحدت'' کہا جاتا ہے اور جو ہندوستانی قوموں کی منفرد

پہچان ہے۔شاعر کے لفظوں میں ؎

قومیں ہوئیں شیر وشکر پل کر تری آغوش میں
مسجد تری آغوش میں ، مندر تری آغوش میں
محفوظ ہے پونجی تری اب تک خلا کی گود میں
اے تربیت گاہِ ملل ، تیری فضا کی گود میں
ہم صوت وہم آہنگ ہیں صدیوں سے ناقوس واذاں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں

اتنا ہی نہیں بلکہ ذرا آگے بڑھ کر جمیلؔ مظہری نے اس نظم میں اپنی بات کو تاریخ کی راہ سے یوں آنکھوں دیکھی حقیقت تک بھی پہنچا دیا ہے ؎

تو نے تمام ادیان کو موقع دیا تلقین کا
پرتھی کے راج استھان میں روضہ معین الدین کا
تیری رواداری کا ہے پائندہ ومحکم نشاں
ہندوستاں، ہندوستاں، ہندوستاں، ہندوستاں

اس نظم میں علامہ جمیلؔ مظہری نے نہ صرف گوتم اور بھیشم کا کردار یاد دلایا ہے اور زندگی کی پیاسی روح کو ''شعور عشق اور کیف روحانی'' سے سیرابی بخشنے کی بات کہی ہے بلکہ انہوں نے ہمیں وہ ماضی بھی یاد دلایا ہے جب کہ ''چین وختن'' کے واسطے یہ سرزمین علم وعمل کا سرچشمہ بن رہی تھی اور مدتوں اس ''زیارت گاہ'' علم وعرفاں میں زمانے کی پیشانیاں جھک رہی تھیں، بقول شاعر آج بھی ع

''اس کی جبیں کی بھیک ہے کشکول مہر وماہ میں''

اور بلاشبہ اے ارض ہند ؎

اک آبشار زندگی تیرے چمن زاروں میں ہے
دل ماتا کا مضطرب ان دودھ کی دھاروں میں ہے
تہذیب انسانی ہوئی اس دودھ سے پل کر جواں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں

اور اب ایک خاص بربطی کیفیت سے آراستہ وپیراستہ اس شاندار پیاری نظم کا یہ آخری بند دیکھئے ؎

ہر رنگ کے، ہر باغ کے ہیں پھول دامن میں ترے
نیرنگیاں آفاق کی سمٹی ہیں گلشن میں ترے
ہر ریت میں ، ہر کھیت میں برسا کیا بادل ترا
ہے ایشیا پر آج بھی سایہ فگن آنچل ترا
لہرا رہا ہے آج بھی تیرے تقدس کا نشاں
ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں ، ہندوستاں

جمیلؔ مظہری ظاہر ہے کہ ایک بڑے شاعر ہیں اور اس لحاظ سے ان کی نظموں، بالخصوص ''بھارت ماتا'' اور ''اے مادر ہندوستاں'' جیسی نظموں میں وفور حقائق کی ذہن ساز پیش کش کے ساتھ، صنعت ترجمہ (گود، آغوش) تجنیس لفظی (ریت، کھیت) اور فوق نقاط مصرع کی صورت میں حسن تکرار کے اوصاف کچھ زیادہ حیران کن نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ لائق توجہ بات یہ ہے کہ ان نظموں میں شاعر نے محض شور وغل، چیخ وپکار اور اُس جیسے دیگر معاملوں سے اپنا دامن ہر طرح بچائے رکھا ہے اور خالص جذبہ حب الوطنی کے ساتھ وطن کی عظمت اور اس سے پیار کے جذبات سامنے لایا ہے یا پھر یوں کہیں کہ اس طرح اُس نے وطنی شاعری کو سرتا سر اخلاقی حدود میں رکھا ہے اور اس سے واضح شعور کے ساتھ عصری ضرورت کی تکمیل کا کام لیا ہے۔

جمیلؔ مظہری کی غنائیت سے بھرپور یہ نظمیں یک گونہ پیامی نظمیں ہیں جو نہ صرف اس دیس کے باسیوں کو قومی یکجہتی کی طرف بلاتی ہیں اور مذہبی وتہذیبی رواداری واحترام کا ذہن دیتی ہیں، بلکہ عالمی سطح پر غیر ممالک واقوام کو بھی ہندوستان کے علمی وروحانی اور تمدنی احسانات یاد دلا کر گویا انہیں ہنددوستی کی طرف بلاتی ہیں اور ذکر وطن کو پیام محبت و امن میں بدلتی چلی جاتی ہیں۔

بیشک وطنی شاعری کے حوالے سے یہ طرز فکر واظہار دوسرے شعرا کے یہاں بھی ہے، لیکن جس وفور متانت اور شرافت کے ساتھ اسے جمیلؔ مظہری کی مذکورہ وطنی نظموں میں کاغذ وقلم کے حوالے کیا گیا ہے اور جیسی خوش آہنگی سے باوصف بنا رکھا گیا ہے، وہ یقیناً بہت ہی منفرد اور بہت ہی موثر ومفید ہے۔ ❁❁

> سنو اے ساکنانِ بزم گیتی — صدا کیا آرہی ہے آسماں سے
> کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر — غلامی کی حیاتِ جاوداں سے
> جوشؔ ملیح آبادی

شجاع الدین شاہدؔ

C-5, Swamchu Society No.1, Near Care Hospital,
Mahada, Malvani, Malad (Mumbai- 400095)
(Mob. 9969039485)

اے زمینِ وطن

اے زمین وطن ، اے زمین وطن
تجھ کو کہتے ہیں سب خوشبوؤں کا چمن
لہلہاتی یہ فصلیں ، یہ شادابیاں
ناز کرتی ہیں تجھ پہ حسیں وادیاں
تیری مٹی میں کتنی ہیں زرخیزیاں
اے زمین وطن ، اے زمین وطن
دے دیا ہے شہیدوں نے تجھ کو لہو
مرمٹے بسملؔ ، اشفاقؔ ، پانڈے ، گرو
جان دے کر رکھی ہے تری آبرو
کوکھ سے تیری پیدا ہوئے یہ رتن
آنچ آنے نہ دیں گے کبھی تجھ پہ ہم
ہم ہیں بچے کسی سے نہیں پھر بھی کم
نام لے کر ترا کھا رہے ہیں قسم
تیری خاطر لٹا دیں گے ہم جان وتن
اے زمین وطن ، اے زمین وطن

❁❁❁

حامدؔ حسین ندوی

Teacher, Hl-Hira Public School, Sharif Colony
Patna - 800004 (Mob. 7870396757)

سرزمین ہند

منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں
گوتم و نانک ، مہابیر و منو کی یہ زمیں
صوفیوں نے بھی ترانے گائے وحدت کے یہیں
منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں
اپنا یہ ہندوستاں ، گویا کہ ہے جنت نشاں
چومتی ہے اس کی پیشانی کو ہر شب کہکشاں
اس کی حرمت پر نچھاور ہے یہاں کا ہر مکیں
منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں
حق پرستوں کے لہو سے یہ زمیں سیراب ہے
ہندی اردو کا چمن اس دیش میں شاداب ہے
ہندو اور مسلم وطن کی دونوں آنکھیں ہیں حسیں
منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں
متحد ہم سب رہیں گے جب تلک ہے زندگی
آنچ بھی آنے نہ دیں گے اس کی عظمت پر کبھی
ہے وطن کی اکثریت کا محبت پر یقیں
منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں
ہے گل و گلزار سے معمور یہ میرا چمن
اس زمیں پر ہیں کھلے جوہی ، گلاب ونسترن
اس زمیں پر حق کے آگے خم ہے حامدؔ کی جبیں
منبع لعل و گہر ہے ہند کی یہ سرزمیں

❁❁❁

محمد مصطفیٰ غزآلی

Belwarganj, Dabgar Toli More, Near Pollo Hospital,Patna City,
Patna - 800007 (Mob. 9798993200)

عظمتِ ہندوستاں

کیسے بیاں کروں میں ہندوستاں کی عظمت
بخشی ہے جس کو رب نے خود ہی عظیم رفعت

اللہ نے نوازا رعنائیوں سے جس کو
کیوں کر حسیں نہ ہو پھر اُس کی تمام زینت

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا یہاں سے
واضح ہوئی اسی سے بادِ وطن کی حرمت

ہے ارضِ ہند تیری عظمت عظیم بے شک
یوں ہی نہیں جہاں میں مقبولِ عام شہرت

خاکِ وطن کی خوشبو ہے مشکبار ایسی
ہوگی نہیں کہیں بھی یوں دلفریب نکہت

کتنی ہی ہستیوں کا مسکن ہے اس زمیں پر
جن کے وجود پر خود نازاں ہے ساری خلقت

پیدا ہوئے یہاں جو تقدیر کے دھنی ہیں
اِس ملک میں رہیں جو ، ہے خوب اُن کی قسمت

موسم ، پہاڑ ، جھرنے ، دریا ، حسیں مناظر
ہر چیز سے عیاں ہے تخلیق رب کی قدرت

اہل نظر نہ کیوں کر اے ہند تجھ کو چاہیں
کی ہے عطا خدا نے تجھ کو ہزار نعمت

رب کریم سے بس میری دعا یہی ہے
پھولے پھلے ہمیشہ یہ گلستانِ الفت

عزت ، وقار اس کا ہر دم عروج پر ہو
بڑھتی رہے ہمیشہ میرے وطن کی شوکت

ہر ذرّۂ وطن ہو محفوظ ہر بلا سے
برسے مرے وطن پر ہر دم خدا کی رحمت

ہوں قاصر صداقت ، معذور ہوں زباں سے
ممکن نہیں غزآلی مجھ سے وطن کی مدحت

❀❀❀

اے وطن

اختر اورینوی

اے وطن ، محبوب جاں تیری زمین و آسماں
شوق کے جذبات ، قدموں پر ترے ہیں گل فشاں

اے بہشت آرزو ، جنت نشاں گلشن ہے تو
بس گیا جو حسن کے پھولوں سے وہ دامن ہے تو

جلوۂ صد رنگ کی تیرے تمدن میں بہار
آبرو گنگ و جمن کی بن گئے ہیں آبشار

ہے فضائے ہند ہر پہلو سے رحمت درکنار
مرمٹوں گا تیری عظمت کے لئے دیوانہ وار

مقالات

پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم
Former Pro-Vice Chancellor, Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University, Patna 800001(Mob.9934688876)

عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے مشابہت رکھتا ہے۔مراد یہ ہے کہ افسانہ اور غزل کی طرح یہاں بھی اشارے اور کنائے سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے۔

خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ نگاری کسی شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔اس کے ذریعہ کسی شخصیت کی تصویر کو چمکایا جاتا ہے۔اردو میں خاکہ نگاری کو مرقع نگاری اور قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔انگریزی میں خاکے کو اسکیچ یا پین پورٹریٹ کہتے ہیں۔

خاکہ نگاری ایک حد تک لطیف مزاح سے تعلق رکھتی ہے۔مزاح کا سہارا لے کر کسی بھی شخصیت کے عیوب اور خوبیوں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔خاکے میں خاکہ نگار کی ایمانداری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور تصورانہ مہارت کا امتحان ہوتا ہے۔ایک چیز ایسی ہے جو خاکے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے، وہ یہ کہ جس کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں اس کے لئے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا کریں اور خاکہ پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے، کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی نہ ہوتیں۔

خاکے میں کسی شخص کے اہم اور منفرد پہلو اجاگر کئے جاتے ہیں۔اچھے خاکہ نگار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی ایسی مہارت و ماہرانہ نفاست سے کرے کہ اس کی شخصیت کا اثر قارئین پر خود بخود پڑے۔ایک اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور انداز دونوں کی جھلک ہو۔خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کے افکار، اس کا زاویہ اور خوبیاں اور خامیاں سب نظر کے سامنے آجائیں۔

شاعری میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔نثر میں بھی اگر چہ عبارت آرائی اور تخیل کی گنجائش آتی ہے، مگر خاکے میں نہ تو جانب داری سے کام لیا جاتا ہے اور نہ ہی خاکے میں مبالغے کی گنجائش ہے۔اس میں نہ تو کسی کی مدح مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی ہجو۔

خاکے کا موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''نام دیو مالی'' اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ''کندن'' کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ اچھے برے، چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکہ لکھا جا سکتا ہے۔بشرطیکہ خاکہ نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خاکہ نگار کا قلم مردہ جسم میں جان ڈالنے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہو۔

خاکہ سوانح عمری سے مختلف ہوتا ہے۔سوانح عمری کسی شخص کے مکمل حالات زندگی پر تذکرہ و تبصرہ، خیالات و افکار کا آئینہ ہوتی ہے، لیکن خاکے میں اس شخص کے کارناموں سے زیادہ کارگزاریوں کو پیش کیا جاتا ہے۔سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہو سکتی ہے، مگر خاکے میں سوانح عمری کی قطعی گنجائش نہیں۔خاکے میں غیر ضروری تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری، یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی سی تصویر ہے۔اس میں نہ اس کی زندگی کے اہم واقعات کی گنجائش ہے اور نہ خاص خاص تاریخوں کی اور نہ زیادہ تفصیل کی۔مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابل ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انہیں دلچسپ انداز سے بیان کر دے تو

یہی خاکہ ہے۔ مصنف نے یہ خصوصیات بچشم خود دیکھی ہوں تو کیا کہنا۔ ورنہ منٹو نے ''میرا صاحب'' لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی ایک کامیاب خاکہ لکھا جا سکتا ہے۔ منٹو نے مسٹر جناح کے ڈرائیور سے اس کے صاحب کے حالات سنے اور یہ خاکہ لکھ کر ان کی زندہ جاوید تصویر بنا دی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے موضوع یعنی ''عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری'' پر اظہار خیال کروں، مناسب ہوگا کہ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتا چلوں۔

اردو میں خاکہ نگاری کا میدان وسیع ہے۔ اچھے خاکے کا ابتدائی عکس انشاء اللہ خاں انشاؔء کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ان میں خاکہ نگاری کی صلاحیت موجود تھی۔ ''دریائے لطافت'' میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں، لیکن خاکہ نگاری کی باضابطہ شروعات دراصل محمد حسین آزادؔ کی معرکتہ الآرا تصنیف ''آب حیات'' سے ہوتی ہے۔ اس میں اگر چہ اردو شعرا پر تبصرہ و تذکرہ ہے، لیکن ''آب حیات'' میں خاکہ نگاری کے بہترین نمونے بھی ملتے ہیں۔ آزادؔ کے بعد ''حیات جاوید'' (الطاف حسین حالی) میں خاکے کے کچھ عناصر ہیں، مگر خاکے سے زیادہ وہ سوانح ہے۔ آزادؔ کے بعد فرحت اللہ بیگ سے خاکہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں۔ ''نذیر احمد کی کہانی: کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اردو کا کامیاب اور اچھا خاکہ ہے۔ نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' میں ''مرزا ظاہر دار بیگ'' ایک عمدہ خاکہ ہے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں سیرت پر زیادہ زور دیا ہے۔ خوجی کا کردار اس بات کی دلیل ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد اردو ادب میں خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، محمد طفیل اہم خاکہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین نے اچھے اور عمدہ خاکے لکھے۔ نثری ادب میں خاکہ نگاری بہت مقبول ہے۔

عصمت چغتائی ہمارے عہد کی مشہور و معروف فکشن نگار کی حیثیت سے اہمیت کی حامل رہی ہیں، لیکن دیگر ادیبوں کی طرح ان کے اظہار کی دنیا بھی وسیع ہے۔ انہوں نے افسانہ، ناول کے علاوہ ڈرامے،

رپورتاژ اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ میرے خیال میں عصمت چغتائی کے یہ دوسرے گوشے فنی اعتبار سے ان کے نمایاں تخلیقی کارناموں کے مقابلے کسی طرح کم تر نہیں۔ عصمت چغتائی نے تقریباً گیارہ خاکے لکھے۔ شعور فن کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے افسانوی فن کی جولانی ان کے خاکوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ناول یا افسانوں میں کرداروں کو تخلیق کرنا بغیر شخصیت فہمی کے ممکن نہیں۔ ایک فکشن نگار میں شخصیت فہمی کا شعور جتنا گہرا اور بالیدہ ہوگا، اس کے تخلیق کردہ کردار بھی اتنے ہی متحرک اور طاقتور ہوں گے۔ عصمتؔ کے فکشن کے کرداروں میں جو ایک رکھ رکھاؤ اور شعور کی بیداری دیکھنے کو ملتی ہے، وہ دراصل عصمت کی شخصیت فہمی کے شعور سے ہی پیدا ہوئی ہے۔

عصمت چغتائی کی شخصیت فہمی کی بنیاد کم وبیش انہیں گیارہ خاکوں پر ہے۔ عصمت نے درج ذیل خاکے لکھے جن میں ''دوزخی'' (عظیم بیگ چغتائی) اسرار الحق مجاز، عشق مجازی (مجاز) میرا دوست میرا دشمن (منٹو) خواجہ احمد عباس، کانٹوں بھری وادیاں (جاں نثار اختر) کچھ میری یادیں (پطرس بخاری) چراغ روشن ہے (کرشن چندر) خوابوں کا شہزادہ (سجاد ظہیر) شامل ہیں۔ عصمت کے خاکوں کے بارے میں ڈاکٹر احمد امتیاز لکھتے ہیں:

> ''عصمت کے خاکوں میں پختہ شعور اور منجھا ہوا آبدار اسلوب اس قدر حاوی ہے کہ شخصیات آب و تاب کے ساتھ اپنی جلوہ گری دکھاتی ہیں۔ ان خاکوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ عصمت نے خاکہ نگاری نہیں کی ہے بلکہ اپنی آتش بیانی سے صور پھونکنے کا کام انجام دیا ہے۔''

عصمت کے خاکہ ''دوزخی'' کے سلسلے میں ڈاکٹر امتیاز کی رائے ہے کہ:

> ''دوزخی'' میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت، ان کے اعمال و افکار اور حرکات و سکنات کو (عصمت نے) اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کی زندگی کی مانوس و نامانوس اور علاحدگی کا ملا جلا تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ نفرت

اور غم وغصہ کے اظہار میں جہاں عصمت کی بے پناہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں عظیم بیگ چغتائی کی پرکشش شخصیت کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن کو عصمت پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ عصمت نے اس خاکے میں نفی کو اثبات میں بدلنے کی کوشش کی ہے اور اس انداز سے کی ہے کہ عظیم بیگ کی شخصیت جاندار، چلتی پھرتی اور متحرک ہوگئی ہے۔ عصمت کی اس آتش بیان خوبی کے سبب ہی منٹو کو یہ خاکہ اس قدر پسند آیا تھا کہ ایک موقع پر انہوں نے اپنی بہن سے کہا تھا کہ اقبال اگر میری موت پر تم بھی ایسا ہی ایک مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ 'دوزخی' میں زبان و بیان کی کاٹ اور طنز کی زہرناکی اس طرح ہے جس طرح عصمت کے افسانوں میں موجود ہے۔''

ڈاکٹر موصوف کے درج بالا خیالات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ''دوزخی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنالینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا، لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ (دوست) کہتے، مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منھ موڑ لیتے۔ ماں کہتی سانپ جنا تھا میں نے۔''

ان چھوٹے چھوٹے جملوں سے زبان و بیان کی تیزی، مزاج کی ترشی، طنز کی کاٹ، نفرت کا اظہار، سب کچھ visualise ہوتا ہے۔ عصمت کے افسانوں اور خاکوں میں یہی چیز مشترک ہے۔ عصمت کے مشاہدے میں شخصیت کے مختلف شیڈز، آبجیکٹ کے مقابلے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ سائے پر گہری نظر ڈال کر کردار یا شخص کی شخصیت کو سمجھنے کی ان کی یہ کوشش حیرت میں ڈالتی ہے کیونکہ اس عمل میں وہ اکثر صحیح نتیجے اخذ کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتی ہیں۔ عصمت اپنے افسانوں کو ہی نہیں خاکوں کو بھی ذہنی اور عملی زندگی کے تضاد سے اُبھارتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یزید کے مداح تھے۔ امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ دنیا میں بڑے دکھ جھیلے، مگر سدا مسکراتے رہے۔''

درج بالا دونوں اقتباس میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کو جس طرح بے نقاب کیا گیا ہے، اس سے وہ سراپا برائیوں کا مجموعہ نظر آتے ہیں، مگر خاکوں کو پڑھ کر قاری کے دل میں ان کے لئے نفرت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ترحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی عصمت کے فن کی اصل کنجی ہے۔

عصمت چغتائی کے خاکہ ''دوزخی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے انور سدید نے درست لکھا ہے کہ:

''عصمت نے عظیم بیگ کے خاکے 'دوزخی' میں اس محبت کو اجاگر کیا جو نفرت کے زیر سطح سدا بہار پھول کی طرح موجود تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد پر فرحت اللہ بیگ کے بعد 'دوزخی' کو ایک مثالی خاکے کی حیثیت دی گئی اور یہ صنف کی فنی بوطیقا مرتب کرنے میں بھی معاون ثابت ہوا۔''

عصمت چغتائی نے مجاز پر تین خاکے لکھے۔ ''اسرار الحق مجاز''، ''عشق مجازی'' اور ''وہ'' بنیادی طور پر یہ صرف مجاز کے شخصی خاکے نہیں بلکہ ان میں خاکہ نگار نے ان کی سوانحی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی خیالات کا موثر اور شستہ اظہار بھی کیا ہے۔

''اسرار الحق مجاز'' ایک جذباتی مضمون ہے، لیکن اس خاکے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مجاز کی شخصیت کو جس اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ انوکھا اور دل موہ لینے والا ہے۔ اس مضمون کے تین حصے ہیں۔ سوانحی حصہ قدرے دلچسپ اور فکر انگیز ہے اور اس حصے میں مجاز کی شخصیت چلتی پھرتی اور متحرک نظر آتی ہے۔ ایک طرف طنزیہ طرز بیان اور دوسری طرف جزئیات نگاری اور تیسری طرف مجاز کی زندگی کے چند اہم

واقعات۔ یہ سب کچھ مصنفہ نے اس طرح ایک دوسرے سے مربوط کئے ہیں کہ شخصیت سازی کے فن کا اصل جوہر اور شخصیت نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ مجاز پر لکھے گئے دوسرے خاکوں میں اس خاکے جیسی تندی اور تیزی نہیں ہے، تاہم یہ بھی عمدہ اور اچھے خاکے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے خاکے میں عصمت لکھتی ہیں:

''اسی ٹیڑھے میڑھے انسان میں جملہ چھوٹی موٹی برائیوں کے ساتھ سب سے بھیانک برائی یہ ہے کہ وہ کبھی لائق شوہر نہ بن سکا اور نہ (اس کے) کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لاجواب دوست بن سکتا ہے، زناٹے دار کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ فی البدیہہ دھواں دھار تقریریں جھاڑ سکتا ہے۔ جٹ جائے تو دنیا کا تختہ اُلٹ سکتا ہے، مگر اس میں کسی کا ''سرتاج من سلامت'' بننے کا بیج ہی نہیں ہے۔ وہ کسی کا ہو کے رہنے کا قائل نہیں۔ خواہ وہ کوئی جذبہ ہو یا پارٹی، کوئی اصول ہو یا کوئی بت کافر۔ اگر اس کا ضمیر کسی بندمعین کے خلاف گواہی دیتا ہے تو اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اسے کسی یقین یا رواج کی رسیوں میں جکڑنا ممکن ہی نہیں۔ وہ نہ کسی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور نہ کسی کی ملکیت بن کر جی سکتا ہے۔''

خواجہ احمد عباس کی شخصیت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر اسی کی نظر جا سکتی ہے جس نے انہیں خوردبین نگاہوں سے دیکھا ہو۔ منٹو پر لکھا گیا خاکہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ منٹو کے حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

''......فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما ایک کمرے کے ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا تھا۔''

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں منٹو کی شخصیت کی پردہ داری کی گئی ہے۔ یہاں زبان و بیان میں تیکھا پن ہے اور نہ طنز کے نشتر بلکہ اس کے پس پردہ شوخی اور بے تکلفی کارفرما ہے۔ مزید انہوں نے لکھا ہے:

''بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا، لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اس کا قد خاصہ لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔''

عصمت چغتائی کے اور لکھے گئے خاکوں پر اظہار خیال کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں، لہٰذا میں ڈاکٹر احمد امتیاز کے اس مجموعی تبصرے پر ہی اکتفا کرتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری کا فن ان معنوں میں ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے کہ اس میں خاکہ نگار متعلقہ شخص کی شخصیت کو ابھارتے ہوئے اپنی شخصیت کو ضم کر دیتا ہے، مگر اس انضمام کے باوجود اس کی شخصیت اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ عصمت کے یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ اپنے خاکوں میں انہوں نے اپنی شخصیت کو ضم کر دیا ہے، لیکن ان کا کردار اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔ خاکوں کی تحریروں میں عصمت کا کردار آہستہ روی سے نمودار ہوتا ہے اور ابتدا سے آخر تک اپنا نقش قائم رکھتا ہے۔ عصمت نے اپنے خاکوں میں تشبیہات واستعارات سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض جگہوں پر ڈرامائی انداز اور تمثیلی رنگ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عصمت ایک بیباک خاکہ نگار کی حیثیت سے اُبھرتی ہیں اور زبان کی کاٹ سے اپنا امتیاز پیدا کرتی ہیں۔''

❁❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

ڈاکٹر سید احمد قادری
7/New Karimganj, Gaya - 823001

ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری کی بازگشت

ڈاکٹر نوشہ اسرار بہار کے قصبہ ہسپورہ (اورنگ آباد) سے نکل کئی ممالک ہوتے ہوئے امریکہ پہنچے اور دوران تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شعری و ادبی تہذیب سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اُسے اپنی شاعری کی بلند خیالی، منفرد انداز و بیاں اور نئے افکار و اظہار کی کیفیت کے ساتھ کچھ اس طرح پیش کیا کہ دیکھتے دیکھتے ان کی شاعری کی بازگشت امریکہ کے ادبی حلقوں سے نکل کر دیگر کئی ممالک کے طول و عرض میں سنائی دینے لگی۔

ڈاکٹر نوشہ اسرار نے اپنی شاعری کے حوالے سے اردو دنیا میں نہ صرف اپنی ایک خاص پہچان بنائی ہے بلکہ ریاست بہار کا نام روشن کرتے ہوئے شعری ادب میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ پیشہ سے یہ سائنسداں ہیں اور ان کا ذوق وشوق شاعری ہے۔ سائنس اور شاعری بظاہر دو الگ الگ راہیں ہیں، لیکن اگر ہم اردو شاعری، بلکہ عالمی سطح کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ سائنس اور شاعری کا گہرا رشتہ ہے اور اس رشتہ کے تعلق سے معیاری اور معنویت سے بھرپور شاعری کی گئی ہے۔ سوداؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؔ، چکبستؔ، فانیؔ سے لے کر دور حاضر تک کے کئی شعرا کی شاعری میں سائنسی علوم وفنون، سائنسی رنگ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

نوشہ اسرار کے اندر شاعری کا ذوق وشوق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم کے دوران ہی پیدا ہوا۔ سائنس (کیمسٹری) کے ساتھ ساتھ شاعری کے اسرار و رموز کو بھی سمجھنے کا یہاں انھیں موقع ملا۔ گرچہ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی شاعری اور شاعرانہ کیفیات کو اپنی سائنسی تعلیم پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ علم کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے آبائی گاؤں ہسپورہ (بہار) سے گیا، گیا سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے ماسکو، سعودی عرب اور پھر امریکہ تک کی خاک چھانی۔ نت نئے تجربات و مشاہدات سے گزرے اور اب وہ سپنوں کی نگری امریکہ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ اس سکونت میں جب انھیں سکون میسر ہوا، تب انھوں نے اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی کے لئے شاعری کو اپنایا۔

نوشہ اسرار نے کئی ممالک کے سفر و قیام کے دوران ان ممالک کی بدلتی ہوئی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی روایات اور قدروں کو بہت قریب سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے اور ان ہی محسوسات کو بڑی خوش اسلوبی سے شعری پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں متنوع موضوعات، افکار واظہار کی ندرت، اسلوب کی انفرادیت اور معنویت کی تہہ داری بھی نمایاں ہیں۔ اپنے پہلے شعری مجموعہ ''دل سے دل تک'' کے پیش لفظ بہ عنوان ''آغاز کچھ ایسا ہے'' میں اپنے ان محسوسات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

> ''علی گڑھ کے بعد پی ایچ ڈی کرنے میں ماسکو گیا۔ واپسی کے بعد ہندوستان، پھر سعودی عربیہ، پھر امریکہ میں ریسرچ کے محکموں میں ملازمت کی۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ہو یا روس کے کمیونسٹ خیالات یا پھر سعودی عرب کا مذہبی ماحول، یہ سب میری شاعری کے لئے معاون ہوئے، بلکہ ان دشت کی سیاحی نے میرے خیالات کو قید و بند سے آزادی دی اور حق گوئی کی راہ دکھائی ہے۔'' (دل سے دل تک، ص ۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ نوشہ اسرار نے اپنی شاعری خاص طور پر نظموں اور غزلوں میں اپنے منفرد لب ولہجہ، نئے عنوانات، عصری تقاضوں کے احساس، مطالعہ ومشاہدہ کی گہرائی و گیرائی اور مختلف سائنسی فلسفے کی منطقیت کو بہت ہی خوبصورت آمیزش کے ساتھ افکار و اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور

حیات وکائنات کے اسرار ورموز کی ایک ایسی فضا سے متعارف کرایا ہے جو بے اختیار توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہے۔ان کی شاعری میں ایسی برجستگی، تازگی، شعلگی اور وارفتگی ہے جوار دو شاعری کے عصری منظر نامہ میں کم ہی دیکھنے کوملتی ہے۔نوشہ اسرار کا دل انسانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، استبداد اور بربریت کو دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہوجاتا ہے۔اپنی اس بے چینی اور بے قراری کی شدّت کو بڑے ہی مؤثر انداز میں معروضیت کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ انسانوں کی بستی میں ظلم کی آندھی، آگ کے بڑھتے شعلوں اور خون کے چھینٹوں سے چیختی انسانیت کے درد وکرب کا اظہار ان کی کئی نظموں اور غزلوں میں موجود ہے۔ایسے درد وغم میں ڈوبے احساسات وجذبات کی بھرپور ترجمانی وہ اپنے مخصوص انداز میں اس فکروفن کی آمیزش کے ساتھ کرتے ہیں، جن میں ان کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی شعور کی کارفرمائی کا پرتو نمایاں ہوتا ہے۔اس حوالے سے یہ چند اشعار دیکھئے ؎

خون کے چھینٹے، آگ کے شعلے،
ظلم کی آندھی، خوف وہراس
یہ انسانوں کی بستی ہے
بن میں پھول کھلتے ہیں
بلبل، باغ، بہار وگلشن، بادل، بجلی، جگنو، رات
پیٹ میں روٹی ہوتو بھلے ہی بھوکوں کو یہ ڈستے ہیں
مال ودولت کی دھن میں سرگرداں
زندگی کے سکوں کو ترستا ہے
ہم فقیروں کی بادشاہی دیکھ چین کی بانسری بجاتے ہیں

نوشہ اسرار کی غزلوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افکار وتصورات کی دنیا محدود نہیں ہے۔معنویت کی وسعت سے بھرپور ان کی غزلیں دل کی گہرائیوں میں اتر کر پیدا ہونے والی کیفیت کو دو آتشہ بنا دیتی ہیں ؎

وہ جا رہا ہے قافلہ ، ہمراہ ہو چلو
دریا بنی وہ بوند ، جو دریا سے مل گئی

اب زندگی کی خواہش نہ موت کا ہے خدشہ
میں اس سے دو بدو ہوں ، وہ میرے روبرو ہے

میں اس خیال سے اقبال جرم کر بیٹھا
زبان جو کھولی تو اس کا بھی نام آئے گا

فکر ومعنی میں ڈوبے یہ اشعار نوشہ اسرار کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں۔ نوشہ اسرار کے خیال میں غزل کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ غزل کہنے کے لئے لہو کو آنکھوں سے اُبلنا پڑتا ہے، دل میں ارمانوں کو مچلنا پڑتا ہے اور آگ پر کروٹیں لیتے ہوئے غزل ہوتی ہے ؎

جب لہو آنکھوں سے ابلے، تو غزل ہوتی ہے
دل میں کوئی ارمان مچلے تو غزل ہوتی ہے
جذبہ عشق میں لپٹا وہ خیالوں کا بدن
کروٹیں آگ پر بدلے تو غزل ہوتی ہے

نوشہ اسرار کی غزلوں میں حیات وکائنات کے اسرار ورموز کے مشاہدات اور تصورات کے اظہار خیال میں جو فکر کی وسعت، فنی حسن اور علامتوں اور استعاروں کی جدت طرازی ہے، وہ ان کی شاعری کو آفاقیت بخشتی ہے۔یہ خصوصیات درحقیقت نوشہ اسرار کی شاعری سے گہری وابستگی اور والہانہ لگاؤ کی مظہر ہیں۔وہ اپنے دوسرے شعری مجموعہ ''جو دل پہ گزری ہے'' کے پیش لفظ ''اپنی بات'' میں اپنی ان شعری خصوصیات کا بیان کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''چونکہ سائنس میرا سبجیکٹ ہے اور تحقیق میری فطرت اور میرا فن بھی، اس لئے مشاہدات زمانہ، جذبات و احساسات اور کائنات کی حقیقت کا انکشاف میری شاعری کا سرمایہ اور ان کی عکاسی میرا فریضہ رہا ہے۔''
>
> (جو دل پہ گزری ہے،ص۹)

ڈاکٹر نوشہ اسرار اپنی شاعری میں اپنے عہد کی بھی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔عصر حاضر کے منظر نامہ کو سامنے رکھ کر نوشہ اسرار کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اپنے اردگرد کے بدلتے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات، واقعات اور سانحات پر ان کی گہری نظر ہے، جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ان کے اشعار دیکھ کر بے اختیار گوئٹے کی یہ بات یاد آتی ہے کہ ''اگر آپ کسی مصنف کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے عہد کو سمجھیں۔'' اس حوالے سے یہ اشعار دیکھیں ؎

شانِ حکومت، رتبہ مسند، ایک نشہ ہے اترے گا
جب مظلوم کے ضبط کا ساغر خونِ جگر چھلکائے گا

نفرتوں سے نہیں ہوتا کبھی نفرت کا علاج
دشمن جاں کو بھی سینے سے لگاؤ تو بنے

جب محبت بے سر و سامان ہوتی جائے گی
یہ بھری دنیا بڑی ویران ہوتی جائے گی

ڈاکٹر نوشہ اسرار کے شعری سرمایہ ادب میں غزلوں کے ساتھ ساتھ ''گھر''، ''خالی بوتل''، ''دل''، ''وہ ہے چمن میرا''، ''سفر''، ''جہاد کامل''، ''کیا عید آئی؟''، ''میدانِ عمل'' اور ''غزل نامہ'' وغیرہ جیسی کامیاب نظمیں بھی ہیں، جو گہرے تاثرات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر ایک خاص کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔

میں تو ان کی شاعرانہ عظمت کا اس دن معترف ہو گیا، جب انھوں نے ایک بڑے مشاعرہ میں اپنی ایک مشہور طویل نظم ''خالی بوتل'' سنائی تھی۔ ہر چند کہ ان کی غزلوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، پھر یوں ہوا کہ ''خالی بوتل'' نے سننے والوں پر کئی بھری بوتلوں کا نشہ سا طاری کر دیا اور ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ''خالی بوتل'' میں شاعری کا یہ رنگ و آہنگ، نیا انداز، نیا لب ولہجہ ——— ایک انفرادی شان سے لبریز اس نظم کی خاص کیفیت دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ آخری بند نے تو دل و دماغ اور فکر احساس کے دریچے وا کر دیئے۔ اسلامی شعار اور تاریخ اسلام کے حوالے سے اس نظم کا جو تیور ہے اور مطالعہ و مشاہدہ کی جو گہرائی و گیرائی ہے، اس نے پوری نظم کو آفاقیت بخش دی ہے۔

عصر حاضر میں مسلم سماج اور قوم کے اندر جس طرح بداعمالیاں اور برائیاں جگہ بنا رہی ہیں اور صالح نظام حیات کی ترغیب دینے والے صحیفہ سے لوگ جس طرح دور ہو کر نہ صرف بدحالی میں مبتلا ہیں بلکہ بے وقعت بھی ہوتے جا رہے ہیں، ان تمام امور کا بڑے اعتماد اور بھرپور معنویت کے ساتھ اس نظم میں اظہار کیا گیا ہے۔ اس نظم کا بند دیکھیں ۔

دنیائے علم و دانش نے افلاک پہ ڈورے ڈال دئے
اور ایک ہو تم کہ آج تلک بس محوِ شورشِ بربط و نے
اب حال یہ ہے بے حال ہو تم
اور بدحالی کے عالم میں
اوروں کی قبائیں نوچتے ہو
اللہ سے شکوے کرتے ہو
کیوں شکوہ نہیں تم کو خود سے؟
گر ہوش میں تم واقعی ہوتے
تو سوچتے پھر یہ ایسا کیوں؟

نوشہ اسرار کی ایک اور خوبصورت اور فکر و احساس سے لبریز نظم ''گھر'' ہے، جس میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب و اقدار کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ جو لوگ اس ملک سے ہجرت کر گئے ہیں، ان کے درد و کرب کی ترجمانی ایک خاص کیفیت کے ساتھ کی گئی ہے۔

نظم ''عید'' اکتوبر ۲۰۰۵ء میں بھارت کے بھج علاقہ میں آئے بھیانک زلزلہ کی یاد میں لکھی گئی بہت متاثر کرنے والی نظم ہے۔ اس زلزلہ میں انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ اس المناک موقع پر جو عید آئی، اسے ان متاثرہ افراد نے کیسے منائی، ان احساسات و جذبات کا اظہار بڑی دردمندی کے ساتھ اس نظم میں موجود ہے۔

ان نظموں کے ساتھ ساتھ دیگر نظموں میں بھی عصر حاضر کے متنوع منظر نامہ کو جس فنکارانہ حسن کے ساتھ نوشہ اسرار نے پیش کیا ہے، وہ فکر و معنی سے لبریز ہیں۔

نوشہ اسرار کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسانی اقدار کے بکھراؤ، رشتوں کی پامالی اور روایت کی گرتی دیواروں سے وہ بے حد متفکر ہیں۔ وہ حیات و کائنات کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے اور برتنے پر یقین رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فن پر دسترس، فکر کی بالیدگی اور موضوعات کے انتخاب نے نوشہ اسرار کو ایک قادر الکلام شاعر کی انفرادیت اور اہمیت بخش دی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو مجھے یقین ہے کہ ان کی شاعری کی بازگشت دور بہت دور پہنچے گی اور ریاست بہار کا نام مزید روشن ہوگا۔

❀❀❀

ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی
HOD. Dept. of Persian, L.S.College, Bihar University, Muzaffarpur - 842001 (Mob.8860793679)

ذبیح اللہ صفا کی بیدلؔ شناسی

مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی (م: ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء) متفقہ طور پر امیر خسروؔ دہلوی، حسن سجزی اور فیضیؔ کے بعد جہان فارسی میں ہندوستانی فارسی ادب کے سب سے بڑے شاعر اور سبک ہندی کے مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ خاص طور پر افغانستان میں ان کی بڑی قدر ہے اور وہاں انہیں قومی شاعر کا درجہ بھی حاصل ہے۔

بیدلؔ کی عظمت اپنی جگہ، لیکن ایرانیوں نے بیدلؔ کی جانب توجہ کرنے میں بہت تامل سے کام لیا اور اپنی ثقافتی اور لسانی برتری کی رعونت میں ہندوستانی فارسی ادب کو مدتوں نا قابل اعتنا سمجھتے رہے۔ سبک ہندی اور بیدلؔ جیسے بڑے شاعروں کو مبہم اور پیچیدہ کہہ کر نظر انداز کرتے رہے۔ امیر خسروؔ، بیدلؔ اور غالبؔ کو قبول کرنے میں انہیں زمانے لگ گئے۔ اقبالؔ البتہ استثنا ہیں، مگر ان پر بھی ''انقلاب اسلامی'' (۱۹۷۹ء) کے بعد ہی بیشتر توجہ مرکوز کی گئی، اگر یہ کہا جائے کہ اقبالؔ کی وجہ سے ہندوستانی فارسی شاعری کی جانب ایرانیوں کی توجہ مبذول ہوئی تو شاید مبالغہ نہ ہو اور اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ کے فلسفوں نے اہل مغرب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور اہل مغرب جب کسی کی تعریف کرنے لگیں تو بہر کیف شرقیوں کے لیے ''مستند ہے ان کا فرمایا ہوا'' لہٰذا ایرانیوں نے بھی بلا تامل اقبالؔ کو ہندوستانی فارسی کا نمائندہ شاعر تسلیم کر لیا۔

بہر حال، ہم بیدلؔ کی بات کر رہے ہیں۔ دیگر وجوہات سے بخوف طوالت گریز کرتے ہوئے اس نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے کہ ایرانیوں کی بیدلؔ کی جانب با قاعدہ توجہ کے محرکات میں ایک اہم محرک سوویت افغان جنگ (۱۹۸۹۔۱۹۷۹ء) کو بھی تسلیم کرنا چاہئے اس جنگ کے دوران جو لگ بھگ ایک دہائی تک چلتی رہی، بڑی تعداد میں افغانیوں نے ایران میں پناہ لی اور ظاہر ہے کہ اپنے ساتھ اپنی ثقافت اور اپنا ادب بھی وہاں لے گئے جس میں بیدلؔ سے ان کی از حد عقیدت بھی شامل تھی۔ ہندوستان سے ثقافتی اور معاشرتی قربت ولسانی اور محاوراتی اشتراک کی وجہ سے افغانیوں کی تفہیم بیدلؔ نے ایرانیوں کی تفہیم بیدلؔ پر مثبت اثر قائم کیا جس کے نتیجے میں ایرانیوں نے جو کہ بیدلؔ کو مبہم اور پیچیدہ شاعر مانتے آئے تھے، رفتہ رفتہ بیدلؔ میں دلچسپی لینی شروع کی اور مجموعی طور پر یہ خوش آیند بات ہے کہ بطور خاص انقلاب اسلامی (۱۹۷۹ء) اور ایران، عراق جنگ (۱۹۸۸۔۱۹۸۰ء) کے بعد ایران میں ہندوستانی فارسی ادب اور مخصوصاً بیدلؔ کی جانب باضابطہ توجہ کی جارہی ہے اور ہندشناسی اور بیدلؔ شناسی کو تاریخی، ثقافتی اور ادبی مطالعات کا ایک مستقل شعبہ مانا جارہا ہے۔

بیدلؔ کی جانب ایرانیوں کی توجہ دیر سے مبذول ہوئی، لیکن ''دیر آید، درست آید'' کے مصداق، خاص طور پر گزشتہ تین دہائیوں میں ایران سے ''دیوان بیدلؔ'' کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کلام بیدلؔ کے انتخاب، تشریحیں، فرہنگیں، تطبیقی اور تنقیدی مطالعے اور بیدلؔ سے متعلق متفرق ادبی جہات پر ہر سال شائع ہونے والی متعدد کتابیں، جامعات میں تحقیقی مقالے، کانفرنسوں کا انعقاد اور مجلّات میں شائع ہونے والے سیکڑوں مضامین بتاتے ہیں کہ عصر حاضر میں ایران میں با قاعدہ ''بیدلؔ'' شناسی کا ایک دور چل رہا ہے۔ ایک بین الاقوامی بیدلؔ فاؤنڈیشن بھی وہاں فعال ہے، جس کے زیر اہتمام ہر سال ''عرس بیدلؔ'' کے نام سے بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوتا ہے، جس میں دنیا بھر کے بیدلؔ شناس شرکت کرتے ہیں۔ اس فاؤنڈیشن کے بانی اور ڈائرکٹر معروف ایرانی شاعر و بیدلؔ شناس، ڈاکٹر ہادی سعیدی کیاسری ہیں۔ راقم السطور نے بھی ان بیدلؔ کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ مزید برآں ہندوستان میں ایران کلچر ہاؤس (نئی دہلی) میں ''انجمن

بیدلؔ'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔اس پلیٹ فارم سے شعری نشستوں اور خاص مواقع پر ادبی پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں ہندوستان کے فارسی گو شعرا اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔''انجمن بیدلؔ'' کے بانی ڈاکٹر علی رضا قزوہ (سابق ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات ایران کلچر ہاؤس) ہیں جو خود ایران کے معروف شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ان کی اور ان کے بعد ڈاکٹر احسان اللہ شکرالٰہی کی کوششوں سے ''انجمن بیدلؔ'' کے بہانے یہاں کے فارسی گو شعرا کی اچھی تربیت ہو سکی اور اب تک یہاں کے نوجوان فارسی گو شاعروں کے کئی مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔خلاصہ یہ کہ ایران میں بیدلؔ شناسی اپنے آپ میں ایک باقاعدہ تحقیق کا موضوع ہے، جس پر تفصیلی گفتگو کسی اور فرصت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

سردست اس تحریر میں بیدلؔ سے متعلق معروف ایرانی محقق و مورخ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے مختصر، لیکن پرمغز فارسی مضمون کا اردو ترجمہ پیش کرنا مقصود ہے۔ڈاکٹر صفا کی اس تحریر سے جہاں بیدلؔ سے متعلق اس بنیادی نظریے کا پتہ چلتا ہے جس نے ایرانیوں کو ایک طویل عرصے تک بیدلؔ سے دور رکھا، وہیں اس میں بیدلؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی دیکھا جا سکتا ہے اور بیدلؔ کو پڑھنے سمجھنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا (۱۹۹۹ء- ۱۹۱۱ء) معاصر ایران کے ایک مایہ ناز اور ممتاز محقق کی حیثیت سے جہان ادب میں اپنی تحقیقی خدمات بالخصوص اپنی گراں قدر تصنیف ''تاریخ ادبیات در ایران'' کی وجہ سے بخوبی جانے پہچانے جاتے ہیں:

> ''تہران یونیورسٹی میں وہ شعبہ زبان و ادبیات فارسی کے صدر اور دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی کے پرنسپل بھی رہے۔۱۹۷۹ء میں ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد مستقل طور پر جرمنی چلے گئے اور جرمنی کے شہر لوبک میں انتقال کیا۔ ان کے علمی کاموں کی طویل فہرست میں متعدد تصانیف، تدوینات اور تراجم شامل ہیں۔ ان کی شہرت دو فارسی تصانیف سے ہے: 'حماسہ سرائی در ایران' اور 'تاریخ ادبیات در ایران'۔موخر الذکر کتاب پانچ جلدوں میں ہے (تیسری جلد دو اور پانچویں جلد تین حصوں میں ہے، گویا کل آٹھ جلدیں ہیں) اگر چہ کتاب کے عنوان میں 'ایران میں ادب کی تاریخ' کی تخصیص موجود ہے، لیکن اس میں ایران کے قرب و جوار کے علاقوں، بالخصوص برعظیم ہندو پاک میں فارسی ادب کی تاریخ کو بھی موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔تنقیدی اور تحقیقی اعتبار سے اب تک ایران اور فارسی زبان میں اس سے بہتر کوئی دوسری تاریخ نہیں لکھی گئی۔''
>
> (ایران کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی صورت حال، عربوں کے حملے سے تیسری صدی ہجری کے آخر تک، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ترجمہ: پروفیسر سید حسن عباس ،تحصیل، کراچی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ج۱، ش۱، ص ۲۵۹)

عصر حاضر میں ڈاکٹر صفا کی تحقیق اور تصانیف نے فارسی ادب کی ہمہ جہت ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور بقول کبیر احمد جائسی:

> ''ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا عصر حاضر کے اُن چوٹی کے ایرانی عالموں کی صف میں ایک ممتاز مقام و مرتبہ کے حامل ہیں، جن کے دم سے علمیت، دقیق سنجی اور نکتہ رسی کا بھرم قائم ہے۔'' (ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے، ص ۵)

قابل ذکر ہے کہ کبیر احمد جائسی نے ''ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے ڈاکٹر صفا پر ایک جامع مونوگراف ۱۹۸۳ء میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔اس کا پیش لفظ ہندوستان کے مایہ ناز محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب نے لکھا ہے۔ یہ مونوگراف ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے احوال زندگی کے علاوہ ان کی دو اہم ترین تصانیف ''حماسہ سرائی در ایران'' اور ''تاریخ ادبیات در ایران'' کے تفصیلی جائزوں پر مشتمل ہے۔علاوہ برآں، عندلیب زہرا کاموں پوری صاحبہ نے ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی ایک کتاب ''مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی'' کا اردو میں ''فارسی ادب کے ارتقا کی مختصر تاریخ'' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب نامی پریس، لکھنؤ سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے۔اسی طرح پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ان کی ایک اور کتاب ''نثر فارسی: از آغاز تا عہد نظام الملک طوسی'' کا اردو میں فارسی نثر کی تاریخ'' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے جو انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی سے ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ پروفیسر سید حسن عباس نے ''تاریخ ادبیات در ایران'' کے

باب اول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو''تحصیل'' کراچی، ج (۱) ش (۱) ص۲۵۹ تا۲۸۷ جولائی، دسمبر۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔

ذیل میں ہم ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی کتاب ''تاریخ ادبیات در ایران'' کی جلد پنجم حصہ دوم سے بیدلؔ سے متعلق ان کے نظریات کا اردو ترجمہ قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی ابن مرزا عبد الخالق، گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر اور بارہویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں فارسی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ نسلاً چغتائی ارلات ہیں۔۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور تحصیل علم کے بعد آغاز جوانی میں اورنگ زیب (حک:۱۷۰۷۔ ۱۶۵۸ء) کے تیسرے بیٹے شہزادہ اعظم شاہ (م:۱۷۰۷ء) کی ملازمت سے وابستہ ہوئے اور فوج میں اچھا عہدہ پایا۔ انہوں نے کبھی اپنی شعری صلاحیتیں شہزادے یا اکابر دربار کے حضور میں ظاہر نہیں کیں۔ ایک روز شہزادے کی مجلس میں شعر وشاعری اور بڑے شاعروں کا ذکر ہورہا تھا، کسی نے کہا آج پورے ہندوستان میں مرزا عبدالقادر سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس پر شہزادے نے کہا ایسا ہے تو ان کو چاہئے کہ میرے لئے ایک قصیدہ لکھ کر لائیں تاکہ میں ان کی صلاحیت کو سمجھ سکوں اور ان کے مراتب میں اضافہ کروں۔ جب یہ بات بیدلؔ تک پہنچی تو وہ برآشفتہ ہوگئے اور ملازمت چھوڑ کر آزادی اور قناعت کی زندگی اختیار کرلی۔

شاہجہان آباد میں ان کا دولت کدہ ارباب شعر وادب اور ان کے ارادت مندوں کا مرکز بن گیا۔ کمال عزت واحترام کے ساتھ اواخر حکومت اورنگ زیب سے محمد شاہ (حک: ۱۷۴۸۔۱۷۱۹ء) کے ابتدائی دور تک فارسی نظم ونثر کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ومشغول رہے اور۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء میں ۷۰ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے گھر کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔

کلیات بیدلؔ کے مکمل اور جزوی نسخے دستیاب ہیں جن میں ان کے شعری ونثری رشحات قلم من جملہ نکات ومراسلات، ان کی متعدد مثنویاں ''عرفان''، ''طلسم حیرت''، ''طور معرفت''، ''محیط اعظم''، ''تنبیہ المهو سین'' قصائد، غزلیات، ترجیع بند، ترکیب بند، مربع، مخمس، مقطعات، مستزاد اور دیوان رباعیات شامل ہیں۔ ان کی رباعیات جن کی تعداد بہت زیادہ ہے علاحدہ مجموعوں کی صورت میں بھی مرتب کی گئی ہیں۔ کلیات بیدلؔ ۱۲۸۷ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۹۹ھ میں منظر عام پر آیا اور مکرر شائع ہوتا رہا ہے۔

ہندوستان کے فارسی داں بیدلؔ سے دو وجہ سے عقیدت رکھتے ہیں: پہلی وجہ یہ کہ انہیں صاحب کمال اور بزرگ طریقت سمجھتے ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ انہیں امیر خسرؔو دہلوی اور عبدالرحمٰن جامؔی جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ سخن کے بعد متاخر دور کا سب سے بڑا فارسی شاعر مانتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نظم ونثر میں صاحب طرز ہیں اور معنی وبیان پر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بیدلؔ عظیم آبادی مضمون آفریں شاعر ہیں اور نازک خیالی میں بے بدل۔ نازک مضامین کو شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ برتنے کا ہنر خوب خوب جانتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں متصوفانہ تخیل، غنائی رنگ، پیچیدہ مضامین، استعاراتی تراکیب تشبیہیں، ابہام وایہام اور نازک خیالی مل جل کر بالکل نئے انداز اور نئے رنگ کا کلام پیش کرتے ہیں جو بزرگان سخن کے کلام سے بالکل الگ انداز میں ہے۔ یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ شاعری کا وہ انداز یا طرز جسے ہم ''سبک ہندی'' کہتے ہیں، بیدلؔ کے کلام میں حد کمال پر نظر آتا ہے۔

میر عبد الرزاق خوافی اورنگ آبادی (مؤلف بہارستان سخن) جو کہ کلام بیدلؔ کی اہمیت سے واقف اور ہر سخن شناس کی طرح ان کے معتقد ہیں، ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مشکل پسند شاعروں میں ممتاز ہیں اور خوش فکر معنی بندوں میں استاد۔ سریر سخن فردار اور شکوہ جمشید کے حامل ہیں اور دارالملک سخن میں رستم کی مانند بے نظیر......آغاز سخن سے اب تک ایسا بلند فکر معنی سنج پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ متقدمین میں امیر خسرؔو دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن جامؔی فضائل صوری وکمالات معنوی کے ساتھ فنون شاعری میں جامعیت رکھتے تھے، لیکن اس دور میں بیدلؔ نے فکر رسا اور طبع بلند کی مدد سے سخن دانی میں مہارت حاصل کی اور سخنوری اور معنی یابی میں کمال وجامعیت کے ساتھ شہرہ آفاق ہوگئے بلکہ لفظ کی

استواری،فقروں کا تناسب،تراکیب ومفردات کی بست و
نشست،خیال کی رنگینی اورانداز کی روانی میں ایک نیا طرز
ایجاد کیا جس میں مستعار تقلیدی طرز اور روایتی انداز
شاعری کومنسوخ کرنے کی قابلیت موجود ہے۔''

بیدلؔ کی جدتوں سے متعلق میر عبدالرزاق خوافی کا بیان اگر چہ درست ہے،لیکن یہ بات کہ ''طرز بیدلؔ'' دوسروں کے ''انداز بیان'' سے بالکل الگ ہے، قابل تامل ہے۔ دراصل بیدلؔ اور ہندوستان میں ان کے معاصرین در واقع ان لوگوں کے پیرو ہیں جنھوں نے نویں صدی کے بعد فارسی شاعری کواس کے روایتی رنگ سے باہر نکالنے کی کوشش کی اور شاعری کی خوبصورتی کواس کے ابہام میں کشف کیا،ایک ایسا ابہام جو مضمون کوتخیلی اور دیریاب تشبیہات واستعارات میں پیش کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔شاعری کا یہ انداز وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ استحکام پاتا چلا گیا، یہاں تک کہ شاعری کے دونوں جزو معنی اور لفظ میں معنی کا جزو بلند اور مضبوط ہو گیا اور اس کے سامنے لفظ کمزور اور پھیکے پڑ گئے۔اس کے نتیجے میں ہر وہ شعر جس میں مضمون اور معنی زیادہ ''تخیلی'' یا اس طرز کے حامیوں کے مطابق ''نازک'' ہوتا، وہ زیادہ پسند کیا جاتا اور ہر وہ شاعر جس کے ہاں زیادہ نازک خیالی اور ابہام پایا جاتا وہ زیادہ بڑا استادسخن مانا جاتا۔ ایسے میں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے میدان میں بیدلؔ اپنے قریب العہد اور اپنے دور کے ہندوستان اور ایران کے تمام شاعروں پر سبقت کے حامل ہیں۔

غور طلب ہے کہ تخلیقی عمل میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی میں افراط اور مظروف کو ظرف کلام پر ترجیح دینا،کلام کو سستی اور شدید ابہام سے دو چار اور تفہیم سے دور کرسکتا ہے۔ بیدلؔ بھی اس نقص سے بری نہیں ہیں۔ان کے بعض شعروں میں تخیل اور تفہیم کے سروں کو جوڑنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل شعر ملاحظہ ہوں ؎

حسرت دمیده ام گل داغم بهانه ای سست
طاؤس جلوه زار تو آئینه خانه ای سست

حسرت کمین مزده و صلی ست حیرتم
چشم بهم نیا مده گوش فسانه ای سست

بیاد آرد دل بیتاب اگر نقش میانش را
به رنگ موی چینی سرمه می گردد فغانش را

این همه دام خیالاتی که برهم چیده ایم
نیست جرم ما و تو ، معجون هستی سنگ داشت

سامان روزی از عرق سعی مشکل است
یعنی در آبرو نتوان نان شکست و ریخت

اسی طرح نئی نئی تراکیب وضع کرنے میں مرزا بیدلؔ سے کچھ ایسی لغزشیں بھی سرزد ہوئی ہیں جو قابل نقد ہیں،مثلاً ؎

جنون جو لانیم هر جا به وحشت آشنا گردد
دو عالم گرد بادم در هوای نقش پا گر دد

اس شعر میں ''جنون جولانی'' اور ''آشنا گردیدن'' کی ترکیبوں کا استعمال ''ساتھ ہونے'' یا ''ہمراہ ہونے'' کے معنی میں اور ''دو عالم گرد بادم......'' میں ''دو عالم میرے لیے گرد باد کے برابر ہیں'' کے مفہوم میں قابل نقد ہیں۔اسی طرح ذیل کے شعر دیکھئے ؎

تغافل چه خجلت به خود چیده باشد
که آن ناز نین سوی ما دیده باشد

بیدلؔ نے اس شعر میں ''بہ خود چیدن'' (خود پر چننا یا ترتیب دینا) کو ''خود پر تحمیل کرنا'' یا خود پر ڈالنا'' کی جگہ استعمال کیا ہے جس سے شعر محاورہ کی رو سے بےمزہ ہو گیا ہے۔اس طرح کی مثالیں بیدلؔ کے یہاں بہت ہیں،لیکن ان نقائص اور لغزشوں سے صرف نظر ان کے ہاں اچھے شعروں کی بھی کوئی کمی نہیں،مثلاً ؎

مطلبی گر بود از هستی همین آزار بود
ورنه در کنج عدم آسودگی بسیار بود

به دل گفتم کدامین شیوه دشوار است انجامش
نفس در خون تپیدو گفت پاس آشنا یی ها

در جگر صد رنگ طوفان کرده ایم
تا سر شکی نذر مژگان کر ده ایم
از هجوم اشك ما بیدلؔ مپرس
یار می آید چراغان کرده ایم

(بقیہ ص ۳۰ پر)

ساحر داؤد نگری
9/322, Lalita Park, Laxmi Nagar, Delhi - 110092 (Mob. 8800489404)

مولانا الطاف حسین حالی: قومی یکجہتی کے باوا

مولانا حالی سے خاکسار کی ذہنی وابستگی ہوش سنبھالتے ہی ہوگئی تھی۔ داؤد نگر میں موجود ''حالی لائبریری'' میں تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں طلبہ بڑی تعداد میں علم پا رہے تھے۔ سہ ماہی ''حالی'' اور ماہنامہ ''راہی'' کی ادارت ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۶ء تک خاکسار نے کی اور ۱۹۸۹ء میں ''مولانا الطاف حسین حالی نمبر'' بھی نکالا۔ خاکسار ''حالی لائبریری'' کا جنرل سکریٹری بھی رہا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۱۵ء میں بعض دوستوں کے ساتھ خاکسار کو پانی پت جانے کا اتفاق ہوا۔ ان دوستوں میں ممبئی کے معروف سماجی و سیاسی کارکن فاضل انصاری، ڈاکٹر ایم جے خالد، سلیم انصاری، مشہور و معروف صحافی سہیل انجم شامل تھے۔ ہمارا یہ وفد پانی پت کے ایک مخلص انسان اور غمگسارِ قوم ڈاکٹر شوکت انصاری کی معیت میں حالی کی قبر دیکھنے پہنچا۔ وہ ایک بہت بڑا احاطہ ہے، جس میں ایک طرف مسجد ہے اور دوسری طرف حضرت بوعلی شاہ قلندر کا مزار ہے۔ اسی احاطے میں مسجد کے جنوب میں ایک گوشے میں مولانا حالی کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پہلے یہ ایک کھلی جگہ تھی، بعد میں اس کے چاروں طرف دیوار تعمیر کر دی گئی اور اسے اب ایک کمرہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ دروازے کے اوپر حالی ہی کا ایک شعر تحریر ہے ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یہاں پہنچ کر سب سے پہلے ہم سبھوں نے ان کی قبر پر سلام کیا اور دعائیں پڑھیں۔ وہاں کی ویرانی دیکھی اس کے بعد سبھی افراد نے مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد جب ہم دوسری طرف بوعلی شاہ قلندر کے مزار پر گئے تو جلوے ہی جلوے بکھرے ہوئے تھے۔ بڑی رونق تھی۔ بڑی گہما گہمی تھی، بڑا طمطراق تھا۔ اگرچہ دوپہر ایک بجے کا وقت تھا۔ دھوپ کی شدت ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دینے کے لئے بے چین تھی، پھر بھی وہاں حاضری دینے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ وہاں کے ہنگامے دیکھ کر مولانا حالی کی آخری آرام گاہ کی ویرانی اور بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بوعلی شاہ قلندر کے مزار پر خوشبوؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ باہر دروازے سے ہٹ کر ایک شخص چھتری لگائے اور خوشبو سلگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مورچھل تھا جس سے وہ اپنے پاس آنے والے عقیدت مندوں کے سروں پر تھپکی دیتا، ان کے لئے پیشہ ورانہ انداز میں دعائیں کرتا اور کچھ نذرانے وصول کر کے خاموش ہو جاتا اور دوسرے عقیدت مندوں کا انتظار کرتا۔

دروازے کی چوکھٹ کے اوپری حصہ پر بے شمار اور مختلف سائز کے تالے لٹکے ہوئے دکھائی دئے، اندر گئے تو چاروں طرف تالوں کے متعدد اسٹینڈ بھی نظر آئے۔ کچھ قدآدم، کچھ درمیانی اور کچھ ذرا چھوٹے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کسی بھی تالے میں چابی نہیں ہے۔ ایک

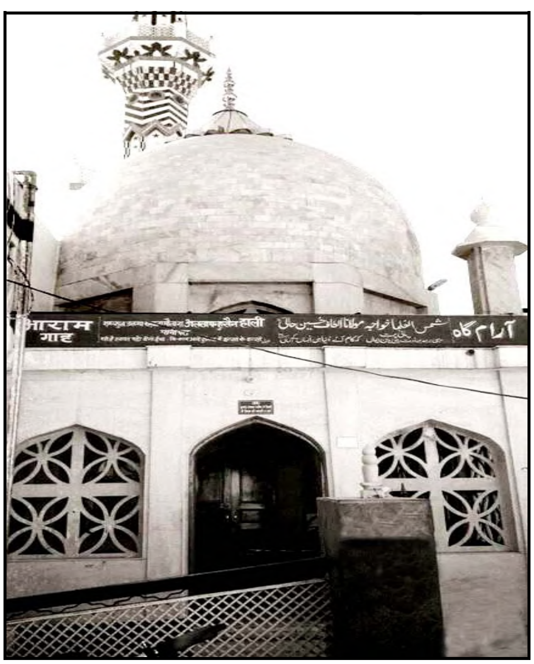

نوجوان قبر کی پائینتی میں بیٹھا عقیدت مندووں سے پھول اور چادر لے کر مزار پر چڑھا رہا ہے۔ اندر کئی قبریں ہیں صاف اور شفاف۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہاں دن میں کئی بار صفائی ہوتی ہو۔ ہم نے کسی مقامی شخص سے لٹکتے ہوئے تالے کے بارے میں جاننا چاہا تو پتہ چلا کہ جن کی منت پوری ہوجاتی ہے وہ تالا کھول کر لے جاتے ہیں، ورنہ وہ تالا وہیں لگا رہتا ہے۔ وہاں مسدس حالی کے بند متواتر یاد آتے رہے ۔

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات چادر چڑھائیں
شہیدوں سے جا جاکے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا حالؔی نے خود یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں اسی احاطے میں دفن کیا جائے۔ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مسدس لکھنے میں وہاں کے حالات کا بھی دخل رہا ہے۔ مولانا حالؔی کی قبر پر دعا پڑھنے کے بعد ہم لوگ اس تاریخی میدان کا دیدار کرنے لگے جہاں تین جنگیں ہوئی تھیں اور جن میں لاکھوں افراد ہلاک ہوئے تھے۔

اس مضمون کا عنوان میں نے ''مولانا الطاف حسین حالؔی: قومی یکجہتی کے باوا'' رکھا ہے۔ حالؔی کو قومی یکجہتی کا ''باوا'' کہنے سے پہلے کئی مرتبہ ہم نے غور کیا، لیکن اس سے بہتر لفظ حالؔی کے لئے ہمیں نہ ملا۔ دراصل حالؔی قومی یکجہتی کے ساتھ اصلاح قوم وملت کے بھی علمبردار ہیں۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے لازمی ہے کہ تعلیم کا راستہ اپنایا جائے، اس لئے انہوں نے تعلیم پر زور دیا ہے۔ یکجہتی کے لئے اخلاقیات اور عمل صالح ہونا ضروری ہے، سواس پر بھی کافی زور حالؔی نے دیا ہے۔

ہندوستانی طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن کو جس قدر نکھارا جاسکا، حالؔی نے اپنی کوششوں سے نکھارا ہے، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ قومی ایکتا، بھائی چارگی کا سبق دینے میں ''باوا'' نے اپنے ملکی بچوں کے تعلق سے ذرا بھول نہیں برتی۔ ایک وقت ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر انہوں نے ہندوستانی قوم کی بیماری کی تشخیص کی اور مرض پہچان کر اس کا علاج بھی تجویز فرمایا۔ نسخہ کے طور پر ''مسدس'' تفویض کی گئی۔ یہ نسخہ بلاتفریق مردوعورتوں دونوں کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔

''مسدس'' کی خوراک روزانہ استعمال میں لانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے حالؔی نے کہا ہے کہ تعلیم اس ''مسدس'' کی جان ہے۔ ہم بھی مسدس میں علم کی بابت لکھے گئے اشعار پڑھ کر حیران رہ گئے۔ میرا خیال ہے کہ سرسید نے مسلمانوں میں جس تحریک کو پھیلایا، حالؔی نے اپنی شاعری کی زبان میں اسے عوام تک پہنچایا ہے۔ مسدس ایک نظم ہی نہیں بلکہ ایک مشعل راہ اور سنگ میل کی حیثیت اور مسلمانوں کی قومی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک تحریک کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم صرف حالی کے فکروشعور کی پختگی اور بالغ نظری ہی کی آئینہ دار نہیں بلکہ یہ حالی کی فنکارانہ بصیرت کا بھی پتہ دیتی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھا ہے:

> ''وہ ایک ایسی کتاب ہے جو پیمبروں اور اوتاروں پر نازل ہوتی ہے۔ وہ ایسا تارا ہے جو شاعری کے آسمان پر چمکا اور ہندوستان میں اس کی وجہ سے قومی اور وطنی نظموں کا لکھنا شروع ہوا۔ ان کے مخاطب صرف ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن ہیں۔''

''مسدس'' سے ایک بند پیش کرکے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہوں، کاش کہ آپ بھی یہ سچائی قبول کرپائیں ۔

نہ علمی مدارس میں ہیں ان کو پاتے
نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے
یہ میلوں کی رونق ہیں جاکر بڑھاتے
پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے
کتاب اور معلم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچنے گانے میں ہیں سب سے آگے

بیشک حالؔی صرف قومی یکجہتی کے ہی ''باوا'' نہیں تھے بلکہ، خالص شاعر اور مصلح قوم بھی تھے۔ شاعری کو انہوں نے اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے بہت سے شاعر وادیب ایسے مہیا کئے جو ملکی سالمیت، باہمی یگانگت، حب الوطنی، قومی یکجہتی کے

پیامبر ثابت ہوئے، جنھوں نے محض چمنستان ادب وگلستانِ شاعری کو ہی اپنی تخلیقات سے نہیں نوازا بلکہ اپنے خون جگر، ذہنی مشق و ہنر سے ملک کو جنت زار، سرسبز وسدا بہار، رنگین بنانے میں اور اسے سینچے و سیراب کرنے میں بھی کوئی فنی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالؔی کے فنی شعور کو بغور دیکھا جائے تو شعرائے کرام میں غالباً ان کا نام سرفہرست ملے گا۔ یقیناً اتحاد واصلاح قوم کا ایک سیلابی جذبہ ان کے اندر موجزن تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں جو خاص الخاص کیفیت ان کے کلام میں یا ان کی تحریروں میں ملتی ہے وہ ان کی وطن پرستی، لاتعصبی، یگانگت اور باہمی وقومی یکجہتی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کے نزدیک انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب وایمان تھا اور انسان دوستی ان کا نصب العین۔ وہ شریف الطبع و ملنسار تھے۔ علم کو شرافت، ہم آہنگی وانسانیت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ گویا وہ محض انسان ومرد کامل بننے کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے ۔

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

ذرا سنئے کہ درس انسانیت دیتے ہوئے خواجہ الطاف حسین حالؔی کتنے سادہ، مگر دلکش الفاظ میں فرما رہے ہیں ۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

مولانا حالی نے وطن کی مٹھی بھر خاک کو بھی بہشت بریں پر ترجیح دی۔ انہیں ملکی کانٹے بھی پردیسی پھولوں سے زیادہ راغب وخوشنما لگے اور انہوں نے لفظوں میں کہا کہ ۔

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

مولانا حالؔی کا ایک ایک لفظ وطن واہالیان وطن کی محبت سے لبریز نظر آتا ہے۔ میل اور ملاپ کو وہ وطن کی سالمیت وخوشحالی کا نسخہ سمجھتے تھے۔ نظم ''حب الوطن'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے
عزت قوم چاہتے ہو اگر
جاکے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

خدمت وطن واتحاد قوم ان کا ایمان تھا۔ انسان دوستی ان کا مسلک تھا اور وطن کی تعمیر وترقی کے لئے زندگی وقف کر دینا ان کے لئے عبادت اعلیٰ تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک ہم سب بلا لحاظ مذہب وملت اپنے ہم وطن بھائیوں کی ہر قسم کی امداد کے لئے آمادہ اور انہیں قعر افلاس وچاہ ذلت سے نکالنے کے لئے مددگار نہیں ہوں گے، تب تک حب وطن کا دعویٰ بس دعویٰ ہی رہے گا۔ قومی ہمدردی کے تئیں دلِ حالؔی کی تڑپ کا اندازہ لگانے کے لئے ملاحظہ ہوں، چند اشعار ۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جاں تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کر کوئی چیز نہ ہو
بھول جائے سب اپنی قدر جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے ان پر گردش افلاک
اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

مولانا حالؔی مساوات کے حامی تھے اور ذات پات سے منحرف رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عدم مساوات رنجش کی تخلیق کا سبب ہے۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ حسب ونسب پر افتخار ایک ڈھکوسلا ہے اور حقیقی توقیر کا انحصار تحصیل علم وہنر پر ہی ہے ۔

اب نہ سید کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شدر پر ترجیح

مولانا حالی نے انسانیت کو بالاترین جانا، قوم کو ذاتیات سے اوپر رکھا، بیداری وطن اور بہبودیٔ قوم کے لئے خوب لگن سے لکھا۔ حریت پسندی ان کی رگ رگ میں تھی اور جذبہ آزادی کو تحریک دینے نیز ہمدردان وطن کو زبوں حالی سے بچانے کے لئے انہوں نے اپنے قلم کا پرزور استعمال کیا۔ زوال قوم پر انہوں نے آنسو بہائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اہل قوم کو ہمیشہ استقلال، بلند کرداری و باہمی یگانگت کا سندیش دے کر انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ اتحاد وموافقت باہمی ان کے لئے دھرم اور ایمان تھا اور منافقت غلامی کی ذمہ دار۔ ان کی نظر میں قومی اتفاق، آبادی وفراوانی کا ضامن ہوسکتا تھا اور نفاق وتقسیم بربادی کے مترادف۔ اس ضمن میں حالؔی کیا خوب فرماتے ہیں نظم ''حب وطن'' کے چند اشعار میں، ملاحظہ کیجئے ۔

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

مولانا حالی نے ہندستانیوں میں آپسی پریم وہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بار بار تلقین بھی کی اور اپیل بھی۔ وہ ہندوستان کو جنت نما بنانا اور معمولی معمولی مسائل کے نام پر پیدا شدہ بیر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ انہیں حقیقتاً قومی یکجہتی کا ''باوا'' کہا جاسکتا ہے۔

حالؔی وہ نام ہے جس نے ہندوستان میں آپسی پریم اور بھائی چارہ کے فروغ کی جتنی کوششیں ہوسکتی تھیں کیں۔ حالؔی نے اپنے وقت میں سماج کی رگوں میں پیوست ہوتی جارہی نفاق کی جڑوں کو کرید کرا کھاڑنے میں جی جان سے اپنی قوت لگادی۔

حالؔی نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے کہ عوام کی سطح فہم کو ٹھیس نہ پہنچے اور جو کچھ کہا جارہا ہے وہ ان کی سمجھ میں بھی آجائے۔ اس کی اہمیت کو سادہ دل انسان محسوس کرسکیں، اسی لئے انہوں نے یکجہتی کے موضوع کو بہت ہی آہستہ انداز میں اپنے تعلیمی اسباق میں ابھارا ہے۔ قوم کی پستی، مسلمانوں کی تعلیمی محرومی، نظام اخلاق اور تہذیب کی اہمیت کو اپنی شاعری میں واضح کیا ہے۔

حالؔی کی شاعری اور نثر دونوں ہی زمانے میں دیکھی جانے والی سامنے کی حقیقتوں کو تخلیقی بیانیہ کا وقار عطار کرنے میں کامیاب رہی۔ اگر آج بھی بہت سے لکھنے پڑھنے والوں کی پسند حالؔی کی شاعری اور نثر ہے تو اس میں زندگی کے ان تلخ وشیریں تجربات کا عمل دخل شامل ہے، جو معرکہ زیست سر کرنے میں حالؔی کو درپیش آئے۔ قوم کی ہمدردی اور غمخواری نے انہیں اس قدر فکرمند بنائے رکھا کہ آخر دم تک قوم کے لئے ہدایت اور اللہ سے مدد کے بھی طلبگار رہے۔ مدد کا طلبگار حقیقی معنوں میں ایک ''باوا'' ہی ہوسکتا ہے اپنے بچوں کے لئے۔ ❁❁

ذبیح اللہ صفا کی بیدلؔ شناسی (ص ۲۶ سے آگے)

مجموعی طور پر مرزا بیدلؔ عظیم آبادی ایک خیال پرداز اور معنی آفریں شاعر ہیں جن کی یہ دانستہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر طرح کی لفظیات اور تراکیب کو اپنے تابع کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں نظم کریں، لیکن کیا کیا جائے کہ طائر خیال ہر لحظہ بلند اور بلند تر چوٹیوں پر جا بیٹھتا ہے اور لفظوں کی بساط ہموار زمین پر بھی مشکل سے بچھ پاتی ہے۔

بیدلؔ کی شاعری سے متعلق اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ ان کے امواج تخیل میں ایسی صفائی اور پاکیزگی بھی مضمر ہے، جس سے صرف نظر کرنا اپنے آپ میں ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ پستی اور بلندی ان کے عہد اور ان کی سرزمین کے بہت سے شاعروں کے ہاں مشہود ہے، لیکن اعلیٰ شاعری کو اُن ضمنی نقائص اور ضعف کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے جن کا ارتکاب شاعر سے بعض شعروں میں ہوجاتا ہے۔ ❁❁

یادیں

ڈاکٹرابراررحمانی

"Tajeen Apartment" 179/22, Zakir Nagar, New Delhi - 110025 (Mob. 9911455508)

راشدانوررآشد: یادیں اور باتیں

راشدانور راشد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ پیارا تو وہ پہلے بھی تھا ہم سب کا۔ ابھی تو وہ جواں سال تھا، ابھی وہ جواں مرگ ہوگیا، یقین نہیں آتا۔ چند ہی ساعتوں میں فیس بک پر ایک طوفان سا آ گیا اور بقول شاعر ''الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوانے کام کیا'' فیس بک پر حادثات، واقعات، سانحات اور معاملات کچھ اتنی تیزی سے گردش کرنے لگے کہ سب کچھ گڈمڈ ہونے لگا اور اس کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی وہ یہی کہ آدمی بہر حال فانی ہے، لافانی تو صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ سن کر مجھے قرار آ گیا۔ میں تصورات کی دنیا میں تیزی سے طواف کرنے لگا۔ راشد کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات اور اس کے انداز گفتگو سب کچھ یکے بعد دیگرے فلم کی طرح نظروں کے سامنے آنے جانے لگے۔

فرشتہ اجل کے سامنے راشد نے آخر کار سپر ڈال ہی دی۔ راشد انور راشد ایک ڈیڑھ سال سے موت و زیست کی لڑائی انتہائی جواں مردی سے لڑتے رہے اور لوگوں کے سامنے خود کو ایسا سنبھال کر رکھا گویا وہ ہشاش و بشاش اور چست درست ہیں اور کسی کو ان کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

وہ ہمیشہ کی طرح ہی لکھتے پڑھتے رہے، چھپتے چھپاتے رہے بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بیماری کے اس دور میں معمول سے زیادہ فعال ہوگئے تھے۔ اس حال میں بھی انھوں نے اہم اور ضروری کام بھی کیے اور کچھ ایسا تاثر دیتے رہے کہ گویا انھیں کوئی آزار نہیں ہے، حالاں کہ اُن دنوں وہ انتہائی کرب اور اذیت سے دوچار تھے، چنانچہ

میں نے جب ابوظہیر ربانی سے ان کی موت کی خبر سنی تو مجھے یک گونہ قرار آ گیا اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ تو نے میرے بھائی کو اذیت سے نجات دی۔ میں نے کینسر کی اذیت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرے والد صاحب نے بھی اسی کینسر کی اذیت سے جوجھتے ہوئے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔ میں نے اس وقت بھی اپنے اباجی کے لیے دعا مانگی تھی اور اللہ نے انھیں اذیت سے نجات دی۔ اللہ ہم سب کو ایسے اذیت ناک امراض سے محفوظ رکھے، آمین! اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کسی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا۔

حقیقت یہ ہے کہ راشد بڑا دلدار اور فرمانبردار انسان تھا۔ وہ دوستوں کے دوست اور یاروں کا یار تھا۔ وہ ایک ایسا پوت تھا جس کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اس نے بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ کھیل سے ہمیشہ کوسوں دور رہتا، چنانچہ اسے کھیلتے ہوئے نہ میں نے کبھی دیکھا اور نہ گھر والوں نے۔ اس طرح اس کے پاس وقت ہی وقت تھا جسے وہ پڑھائی لکھائی کے کام میں لاتا۔ وہ بچپن سے ہی اردو کے اچھے اور بڑے رسالوں میں چھپتا رہا۔ جب اس لڑکے کی عمر ماہنامہ ''کھلونا'' اور ماہنامہ ''نور'' جیسے رسالے پڑھنے کی تھی تو وہ ''شمع'' اور ''آج کل'' جیسے رسالوں کا مطالعہ کررہا تھا۔

راشدانور راشد سے میری پہلی ملاقات ہمارے آفس پٹیالہ ہاؤس میں محبوب الرحمان فاروقی، نرگس اور افتخار کے ساتھ ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی راشد نے خود کو جس طرح سے پیش کیا، وہ ہم سب کے لیے نمونۂ عمل تھا۔ راشد کا جثہ اور حلیہ قابل رشک حد تک بہت خوب تھا۔ راشد کے طرز تکلم سے ہم سبھی بہت متاثر ہوئے۔

محبوب الرحمان فاروقی صاحب ''آجکل'' کے ایڈیٹر تھے۔ وہ بھی راشد سے مل کر بہت متاثر ہوئے، چائے وائے کا دور چل رہا تھا، فاروقی صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں حسب عادت راشد کو تاکید کی کہ اپنی صلاحیتوں کا مثبت استعمال کرے۔ اس وقت اردو میں فنون لطیفہ پر

مضامین کی بہت کمی ہے، اس لیے فنون لطیفہ پر اپنے مضامین کی ایک سیریز تیار کرے کہ اس کی بہت ضرورت ہے۔ شاعری تو خالی وقتوں کا مشغلہ ہے، حالانکہ راشد انور راشد کی ادبی زندگی کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہی ہے۔

محبوب الرحمان فاروقی کی بات مان لینے کا مطلب یہ تھا کہ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے، لیکن راشد نے اپنی خداداد صلاحیت سے گھر اور گھاٹ دونوں کو ایک کر کے دکھا دیا۔ راشد انور راشد کا کمال ہے کہ اس نے اس میں توازن بنائے رکھا۔ پٹیالہ ہاؤس جس میں کبھی ''آجکل'' کا دفتر ہوا کرتا تھا وہی ''آجکل''، جس کے کبھی جوشؔ ملیح آبادی ایڈیٹر ہوا کرتے تھے، لیکن جوشؔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے کامیاب مدیر نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جوشؔ نے جب اپنا رسالہ ''کلیم'' نکالا تو نکلتے ہی بند ہونے کی نوبت آگئی تو یاروں نے اپنی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلیم کو ''نیا ادب'' کے ساتھ جوڑ کر ''نیا ادب اور کلیم'' کے نام سے مجلّہ کو جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن بے سود، آخر کار وہ بھی ڈوب گیا۔

محبوب الرحمان فاروقی کے مشورے پر راشد نے حامی بھر لی، لیکن اس نے ہم سے سوال کیا کہ اس خشک موضوع پر میٹر کہاں سے آئے گا۔ محبوب الرحمان فاروقی اپنی سیٹ سے اٹھ کر راشد انور راشد کے پاس آئے اور راشد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ساتھ چلنے کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں پبلی کیشن ڈویژن کی شاندار لائبریری میں آئے۔ وہاں محبوب صاحب نے انگریزی سیکشن سے فوٹوگرافی پر کئی کتابیں نکال کر راشد کو دیں اور سنجیدہ مطالعے کی تاکید کرتے ہوئے کہا، اگر تم اسے ہضم کر سکو تو کرو اور اس کے بعد لکھنا شروع کرو۔ ساتھ ہی ہم نے اس سے کہا کہ تن آسانی اور سہل پسندی سے کام نہیں بنے گا۔ دوسری زبانوں کی کتب، خاص کر انگریزی میں موجود اس قسم کی چیزوں کو مزید تلاش کرو اور پھر ان کتب کا عمیق مطالعہ کرو اور جب آپ کے اندر سے لکھنے کا آپ سے تقاضا شروع ہو جائے تو پھر اس موضوع پر لکھنا شروع کر دو، لیکن آج معاملہ الٹا ہے، لوگ پڑھتے کم ہیں اور لکھنے کے لیے ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں۔ کھلی آنکھوں سے فطرت کا نظارہ بھی ضروری ہے۔ چنانچہ راشد انور راشد نے ہماری بات گرہ میں باندھ لی۔ اس نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے علاوہ دلی کی دوسری لائبریریوں کو چھان مارا اور میٹر کی تحصیل کو اولیت دی۔ انھوں نے جلد ہی ''فوٹوگرافی'' پر ایک مضمون لکھ کر ''آجکل'' کے دفتر میں جمع کر دیا جسے ہم نے پڑھنے کے بعد فوراً شائع کر دیا۔ اسی طرح تواتر سے انھوں نے ''ہندوستانی مصوری''، ''مصوری کا فن اور پکاسو''، ''جدید فرانسیسی مصوری''، ''ہندوستانی موسیقی''، ''ہندوستانی رقص''، ''کٹھ پتلی کا رقص'' جیسے عنوانات سے مضامین تحریر کیے اور پھر جلد ہی انھوں نے فنون لطیفہ پر ایک کتاب اسی نام سے شائع کروا دی۔

اس کتاب کے چھپتے ہی اردو کی ادبی دنیا میں ایک شور سا بلند ہوا اور کتاب کا شہرہ دور دور تک ہو گیا۔ راشد انور راشد راتوں رات اردو دنیا کے ہیرو بن گئے اور کچھ ایسا بھی ہوا کہ فنون لطیفہ پر کتاب دیکھ کر لوگوں کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی، لیکن بعض لوگوں نے اسے بڑی حسرت کی نظر سے دیکھا اور انھوں نے اپنی انتہائی سوچ کا مظاہرہ کیا۔ جامعہ کے انٹرویو میں بجائے اردو ادب کے فنون لطیفہ سے متعلق سوالات کی بوچھار کر دی اور بے چارہ راشد نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، انٹرویو میں اس یورش سے ہلکان سے ہو گیا۔

فنون لطیفہ پر اردو میں راشد انور راشد کی یہ کتاب ایک اضافی کارنامہ ہے، لیکن ہمارے ان نام نہاد ایکسپرٹ نے اس کارنامے کو کلنک بنا کر رکھ دیا۔ فنون لطیفہ کے بہت سے شعبے جن پر راشد کو ابھی لکھنا باقی تھا ان میں نقاشی، مجسمہ سازی اور خطاطی کے علاوہ اسٹیج اور تھیٹر جیسے عنوانات خاص ہیں۔ راشد اس پر لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کی دوسری ذمے داریاں ان کے آڑے آتی رہیں۔

راشد کی وفات کے فوراً بعد مشتاق احمد نوری نے فیس بک پر ایک تعزیتی مقالچہ پوسٹ کیا تھا۔ اس میں انھوں نے راشد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ راشد کی خدمات اور ادب کے تئیں خود کو وقف کر دینے کا جذبہ لائق تحسین ہے۔ مشتاق احمد نوری صاحب قاضی عبدالستار سے بہت متاثر ہیں اور راشد قاضی صاحب کے بہت قریب تھے، چنانچہ انھوں نے راشد کے بھروسے قاضی صاحب کے اعزاز میں ''ایک شام قاضی عبدالستار کے نام'' سے منانے کا ارادہ کیا۔

مشتاق نوری صاحب نے راشد انور راشد کی اس قربت کا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے راشد کو قاضی صاحب سے اس پروگرام کے بارے میں بتایا اور انھوں نے علی گڑھ سے پٹنہ آنے پر آمادہ کرنے کی ذمے داری نبھائی۔ اس طرح مشتاق نوری نے راشد کے ذریعے قاضی صاحب تک رسائی حاصل کر لی۔ بہار اردو اکادمی کے بینر تلے قاضی صاحب کے ساتھ ایک شام منائی گئی جو بہت کامیاب رہی۔ اس پروگرام میں راشد نے قاضی صاحب پر ایک خوبصورت خاکہ بھی پڑھا تھا جو حاصل شام تھا۔

یادش بخیر! ایک بار میں اپنی بٹیا تنزیل کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی میں میڈیکل کے انٹرینس ٹیسٹ کے لیے گیا ہوا تھا۔ ٹیسٹ کی پہلی شام کو ہی ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر خاور خاں سرحدی نے پروگرام کے مطابق ہمیں ریسیو کیا اور اپنی رہائش گاہ سرائے میر دہلی گیٹ لے گئے۔ رات ہم نے وہیں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی ہم نے پورے سامان کے ساتھ تنزیل کے امتحان سینٹر جانے کا فیصلہ کیا کہ ہمارے میزبان تو یقیناً بہت مہربان تھے جنھوں نے ہمیں عزت و احترام کے ساتھ کھلایا پلایا اور رات کو ہمارے سونے کا انتظام کیا، لیکن ان کی رہائش گاہ ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہر طرف گندگی ہی گندگی تھی، جہاں لوٹ کر پھر دوسری رات گزارنا ہمارے بس کا نہیں تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی علی گڑھ ہے جس شہر میں مسلم یونیورسٹی قائم ہے۔

یونیورسٹی کا علاقہ بالکل صاف ستھرا اور مزین ہے جب کہ شہر کے بعض علاقے بالکل اس کے برعکس ہیں۔ خاور خاں سرحدی خود کو جونیئر بشیر بدر کہلانا پسند کرتے تھے۔

ٹیسٹ شام تک تھا اور جب وہ ختم ہوا تو علی گڑھ سے دلی جانے کے لیے ٹرین، بس یا کوئی بھی ذریعہ نہ تھا اور ہم لوگ علی گڑھ میں ہی رکنے پر مجبور تھے۔ علی گڑھ کا یہ ٹیسٹ بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور اس روز علی گڑھ میں ٹھہرنے کی سبھی جگہیں پہلے سے ہی بک کرالی جاتی ہیں۔ ہم سے یہ غلطی ہوئی تھی اور ہم نے اس وقت اپنے کو بڑا ہی بے بس اور مجبور پایا۔ علی گڑھ میں ویسے تو ہمارے شناسا بہت سے ہیں، لیکن کسی نے بھی اپنی شناسائی کا پاس و لحاظ رکھا اور نہ ہی ہماری پریشانی کو جاننے کی کوشش کی۔

ابھی ہم حیران و پریشان سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارا موبائل بجنے لگا۔ ہم نے موبائل آن کیا۔ آواز آئی:

''ارے ابرار بھائی آپ کہاں ہیں؟ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا، میں نے آج ہی کرایے کا مکان لے لیا ہے اور آج ہی شفٹ کیا ہے، لیکن ابھی کمرے کی صفائی اور ترتیب و تزئین میں وقت لگے گا۔ فی الوقت ہم لوگ جیسے تیسے بھی رات گزار لیں گے۔''

میں نے راشد کی اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا اور اس کے بتائے پتے پر ہم رکشے سے پہنچ گئے۔

راشد ہر فن مولا ادیب و فنکار تھے۔ شاعری میں کامرانی کے جھنڈے گاڑ کر ایک پہچان بنالی تھی۔ تنقید میں بھی انھوں نے اچھی جگہ بنائی تھی اور تحقیق میں بھی شد بد رکھتے تھے۔ اب آخری عمر میں انھوں نے فکشن کی طرف بھی رشک بھری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ حسن اتفاق کہ راشد قاضی عبدالستار کی صحبت میں آ چکے تھے جہاں انھوں نے ناول کے فن اور باریکی کو خوب اچھی طرح سے سمجھا جس سے فائدہ اٹھا کر راشد نے ایک تاریخی ناول لکھ ڈالا جس کی اطلاع مشتاق احمد نوری کے مذکورہ مقالچے سے ملی، لیکن راشد کی یہ خواہش اس وقت تک تکمیل تمنا کو نہیں پہنچے گی، جب تک کہ اسے زیور طبع سے آراستہ نہ کر دیا جائے۔ راشد کے قریبی دوست کوثر مظہری اس کار خیر میں اپنا یوگدان دے سکتے ہیں اور اس کار خیر میں مشتاق احمد نوری بھی اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

راشد علم کے سمندر کے ایک بہترین غواص تھے جو اس سمندر کا پورا پانی پی جانا چاہتے تھے، لیکن ایسا ممکن نہیں، وہ ایک انسان ہی تو تھا۔ چند قطروں پر ہی قناعت کرنا پڑا۔ انہی چند قطروں میں سے ہی وہ ایک قطرہ تھا کہ جس نے اسے سیرت النبی پر ایک کتاب لکھنے پر آمادہ کیا اور اس کے لیے بھی وہ پر تول رہے تھے، لیکن ان پروں میں اب وہ پہلی سی طاقت کہاں رہ گئی تھی۔ مطالعہ سے حاصل شدہ میٹر اور مواد کی فراہمی کا مرحلہ شاید طے کر چکے تھے، لیکن مشیت نے اتنی مہلت نہ دی، پھر بھی نیت کا اجر تو ملے گا ہی۔

بات قاضی عبدالستار صاحب کی نکل آئی ہے تو عرض کرتا

چلوں کہ قاضی عبدالستار سے میرے مراسم کبھی اچھے نہیں رہے۔ ۱۹۸۵ء میں پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کے ریسرچ کانگریس میں قاضی صاحب کے بڑبولے پن کی نوجوان ادیب وشاعر اور ریسرچ اسکالرز نے جم کر مخالفت کی، ان نوجوانوں نے اپنا بھرپور احتجاج درج کرایا تھا، قاضی صاحب نے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ:

''میں نئی نسل کو نہیں پڑھتا''

پھر کیا تھا ہماری ینگ بریگیڈ نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا اور اپنا سخت احتجاج شروع کر دیا اور محفل میں بدمزگی سی پیدا ہوگئی۔ اس احتجاج میں میرے ساتھ خورشید اکبر، قیصر زماں، اشفاق احمد عارفی، امام اعظم اور دیگر نوجوانان شامل تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس کانگریس میں میرے استاذ پروفیسر محمد حسن صاحب بھی موجود تھے، انھوں نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم خاموش بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب سے میرا دوسرا معرکہ ان کے ایک توسیعی خطبے کو لے کر ہوا جس میں انھوں نے اپنے موضوع ''معاصر اردو ناول'' پر خطبہ دیا تھا۔ اس خطبے میں موضوع کے ساتھ انھوں نے ہرگز ہرگز انصاف نہیں کیا تھا۔ چنانچہ میں نے ''قصہ ایک توسیعی خطبے کا'' لکھا اور دلی اردو اکیڈمی کے رسالہ ''ایوان اردو'' دسمبر ۲۰۰۳ء میں شائع کروا دیا، پھر کیا تھا ہر طرف اس خطبے اور اس پر احتجاج کا چرچا ہونے لگا اور ایک عرصے تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا رہا۔ یہاں عرض کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ راشد نے مجھے قاضی صاحب کا ایک پیغام پہنچایا تھا کہ قاضی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کیا آپ ملنا پسند کریں گے؟ قاضی صاحب بستر مرگ پر جا چکے تھے، چنانچہ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور فوراً ملنے کی حامی بھر لی، لیکن افسوس کہ اس کا موقع نہیں آیا اور اب نہ تو قاضی صاحب رہے اور نہ ہی میرے عزیز راشد انور راشد ہمارے بیچ رہے، لہٰذا اب اس معاملے پر یہیں مٹی ڈالتے ہیں۔

راشد مجھ سے کم وبیش دس سال چھوٹے تھے۔ عمر کے اس تفاوت کا وہ خیال رکھتے تھے، لیکن علمی معاملے میں وہ بھی میری طرح چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق روا نہیں رکھتے تھے۔ ہم دونوں پہلی بار دسمبر ۱۹۹۶ء میں ایک ساتھ کلکتہ کے رسالہ ''انشا'' کے ''نیاز فتح پوری نمبر'' میں شائع ہوئے تھے اور ہم دونوں ہی خوش تھے۔ وہ ہمارے لکھنے پڑھنے اور چھپنے چھپانے کا بہترین دور تھا۔ راشد نے ہمیشہ لکھنے اور پڑھنے میں خود کو لگائے رکھا بلکہ ادب سے حد درجہ وابستگی رہی، لہٰذا وہ مجھ سے آگے نکل گئے ہوں، کوئی بعید نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ راشد کی ادبی شناخت کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے جس سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اور آخر تک وہ شاعری کی زلف وگیسو سنوارتے رہے۔ معاصر اردو شاعری میں راشد انور راشد کا اپنا ایک خاص مقام ہے جس سے جدید اردو شاعری کا کوئی نقاد انکار نہیں کرسکتا۔ خاص بات یہ ہے کہ راشد محض چھوٹی نشستوں میں اپنے اشعار نہیں پیش کرتے تھے بلکہ میں نے پٹنہ کے ہندو پاک مشاعرے میں چھوٹی عمر کے راشد انور راشد کو پڑھتے ہوئے سنا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

ان کا ایک شعری مجموعہ 'شام ہوتے ہی' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں سامنے آیا تھا جو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ چند اشعار اس مجموعے سے پیش خدمت ہیں۔ پہلی غزل جو حمد یہ غزل ہے اس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو ؎

جس کو توفیق ہو سمجھے گا اشارے تیرے
ہر طرف شان سے بکھرے ہیں نظارے تیرے

لیکن جب ہم دوسری غزل کی طرف بڑھتے ہیں جو صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا کہ راشدؔ نے یہ غزل اپنی زندگی پر ہی لکھی ہو ؎

اب تو ہر سمت کڑی دھوپ ہے سایہ دینا
اے خدا آنکھوں کو خوش رنگ نظارہ دینا
زندگی درد کی لذت میں بسر ہوجائے
اب اگر زخم کوئی دینا تو گہرا دینا
شوق سے آج مجھے روند کے جاؤ لیکن
کل مری یاد میں ایک مقبرہ بنوا دینا
اس جزیرے میں کوئی نقش نہ مل پائے گا
اجنبی لوگ ہیں تم راستہ بتلا دینا
میں اگر لوٹ کے آیا نہ سفر سے راشدؔ
کچھ نہ کچھ کہہ کے تمناؤں کو بہلا دینا

(بقیہ ص ۴۲ پر)

احمد صغیر
"Hanif Manzil" Koyli Pokhar, Police Line, Gewal Bigha, Gaya-823001 (Mob. 9931421834)

بدنام نظر: یادوں کے آئینے میں

صدا و لفظ امانت رکھ رہا ہوں میں خلاؤں میں
ہوائیں اگلی نسلوں کو مری غزلیں سنا دیں گی

شاعر جب شاعری کرتا ہے تو اسے پتہ نہیں ہوتا کہ میرے بعد میری شاعری کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی شاعری نئی نسل پڑھے گی یا اسے فراموش کر دیا جائے گا۔ میں بدنام نظر کی شاعری پر بات کرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ ان کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات کی مختصر روداد لکھ دوں۔

جب میں نے ادب میں قدم رکھا تو گیا کے دوسرے شعرا و ادبا کے ساتھ بدنام نظر سے بھی متعارف ہوا۔ اس وقت کلام حیدری کا بڑا شہرہ تھا۔ گیا کی ادبی سرگرمیاں ان ہی کے دم سے قائم تھیں۔ بیرون شہر سے جو بھی ادیب یا شاعر گیا میں قدم رکھتا، ان کا مہمان ہوتا۔ کلام حیدری میں ایک خاص بات تھی کہ شہر کی چھوٹی بڑی سبھی ادبی نشستوں میں شامل ہوتے تھے اور یہی حال بدنام نظر کا بھی تھا۔ ان سے جب بھی ملتا بہت خلوص سے ملتے۔ اس وقت وہ باٹم برج کے پاس ایک مکان میں رہتے تھے۔ اکثر شام میں، میں اور خورشید حیات ان کے گھر پہنچ جاتے اور دیر رات تک بیٹھے ادب کی باتیں کرتے رہتے۔ ہم لوگ جو بھی افسانہ لکھتے ان کو ضرور سناتے۔ وہ بھی جو شعر کہتے ہم لوگوں کو سناتے۔ اس وقت گیا میں ادبی سرگرمیاں بہت تھیں۔ ''شبستان ادب''، ''بزم قلمکار''، ''بزم انجمن''، ''پاسبان ادب''، ''انجمن ترقی اردو'' اور کئی تنظیمیں سرگرم تھیں اور بدنام نظر ہر پروگرام میں شریک ہوتے۔

بدنام نظر دبلے پتلے لمبے قدم کے آدمی تھے۔ زلفیں دراز،

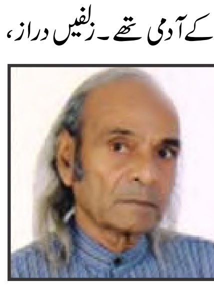

آواز میں کھنک، اگر ندا فاضلی اور بدنام نظر کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو ہر آدمی یہی کہے گا کہ دونوں بھائی ہیں۔ ندا فاضلی سے ان کی دوستی بھی خوب تھی اکثر مشاعروں میں دونوں ساتھ ہوتے۔ ایک بار بدنام نظر نے گیا میں آل انڈیا مشاعرہ کرایا جس میں ندا فاضلی بھی تشریف لائے تھے اور انہوں نے ان سے صرف آنے جانے کا کرایہ لیا تھا، معاوضہ ایک پیسہ نہیں، صرف یہ کہا تھا کہ میں دو تین دن تک تمہارے گھر تمہارے ساتھ رہوں گا اور ادب کی باتیں کروں گا۔ وہ مشاعرے کے بعد تین دن تک گیا میں رُک گئے تھے اور خوب انجوائے کیا تھا۔ ایک مشاعرہ گیا کے ''پریم ٹاکیز'' میں بھی کرایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی مشاعرہ کسی سنیما ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس دن نائٹ شو نہیں دکھایا گیا اور اس کی جگہ پر مشاعرہ ہوا۔ ''پریم ٹاکیز'' کے مالک بدنام نظر کے دوست تھے اور انہوں نے نہ صرف اپنا سنیما ہال مشاعرے کے لیے دیا تھا بلکہ مالی تعاون بھی کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی دھوم کافی عرصے تک رہی۔

بدنام نظر ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی سوچتے تھے۔ اس وقت بہار میں کانگریس کی سرکار تھی اور گیا کے ایم۔ ایل۔ اے۔ جے کمار پالت تھے۔ بدنام نظر اور جے کمار پالت میں خوب چھنتی تھی۔ دونوں گہرے دوست تھے۔ جے کمار پالت نے ایک اردو کا اخبار بھی نکالا تھا جس کے ایڈیٹر بدنام نظر تھے۔ یہ اخبار کافی دنوں تک شائع ہوتا رہا۔

بدنام نظر کی ایک بیٹی روفی نظر اور ایک بیٹا یشا النظر ہیں۔ روفی نظر کی شادی گیا میں ہوئی اس لیے وہ گیا میں رہ گئیں۔ یشا النظر کی بھی شادی گیا میں ہی ہوئی، لیکن وہ نوکری کے سلسلے میں دلی چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔

۱۹۸۰-۸۲ء کے درمیان بدنام نظر نے ایک ادارہ ''آل لینگویجز رائٹرس ایسویشن'' بنایا تھا۔ اس میں ہر زبان کے شاعر اور ادیب کو شامل کیا گیا تھا۔ اس وقت گیا میں کلپنا سنگھ نام کی ایک شاعرہ ہندی میں بڑی تیزی سے ابھر رہی تھیں وہ بھی اس ادارے میں شامل

تھیں۔ خورشید حیات بھی اس میں شامل تھے۔اس کے تحت چھوٹے بڑے بہت سارے پروگرام ہوئے جس میں ہر زبان کے ادیب اور شاعر شامل ہوتے تھے، پھر دھیرے دھیرے لوگ بکھر گئے ۔ خورشید حیات نوکری ہوجانے کے بعد بلاسپور چلے گئے، کلپنا امریکہ چلی گئیں، میں دلی چلا گیا اور بدنام نظر شیخ پورہ اپنے آبائی گاؤں کنڈا چلے گئے۔

میں نے جب ادب میں قدم رکھا تو زیادہ تر افسانے ہی لکھتا تھا، لیکن کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتا تھا۔ میری آواز بہت اچھی تھی اور ترنم سے غزل پڑھتا تھا۔ ایک دن بدنام نظر نے کہا:

''تمہاری آواز بہت اچھی ہے اگر کلاسیکل موسیقی سیکھ لوگے تو اچھے سنگر بن سکتے ہو۔''

وہ مجھے لے کر گیا کے مشہور موسیقی کے استاد کامیشور پاٹھک کے پاس گئے اور بتایا کہ یہ ادیب اور شاعر ہیں، انہیں موسیقی سیکھا دیجئے اور میں روز شام ان کے پاس جانے لگا۔ وہیں سے میں نے میوزک میں ایم۔اے بھی کیا۔ چونکہ میں گھر پر ریاض نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی میرے پاس ہارمونیم وغیرہ تھا، اس لیے جو بھی سیکھتا تھا کامیشور پاٹھک سے ہی سیکھتا تھا، لیکن پھر میں دلی چلا گیا اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

بدنام نظر کی نظموں کا مجموعہ ''تہی دست'' ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آیا، جس میں کل ۷۷ نظمیں شامل ہیں۔ صفحہ آٹھ پر ایک نظم ہے ؎

ہزار بار ہوا یوں کہ جب امید گئی
گلوں سے واسطہ ٹوٹا، نہ خار اپنے رہے
گماں گزرنے لگا ہم کھڑے ہیں صحرا میں
فریب کھانے کی جارہ گئی نہ سپنے رہے
نظر اٹھا کے کبھی کبھی دیکھ لیتے تھے اوپر
نہ جانے کون سے اعمال کی سزا ہے کہ آج
یہ واہمہ بھی گیا سر پہ آسمان ہے کوئی
وقت بدلتا گیا سبھی لوگ اِدھر اُدھر گئے

بدنام نظر کافی عرصے تک خاموش رہے۔ ان دنوں میں دلی میں مقیم تھا۔ ایک دن ''استعارہ'' کے دفتر میں پیشا النظر پہنچے۔ کافی دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ بدنام نظر صاحب کی خیریت دریافت کی، اس نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں اور میں دلی میں نوکری کررہا ہوں، پھر پیشا نے صلاح الدین پرویز سے بدنام نظر کی بات کرائی۔ صلاح بھائی نے ان سے غزلیں بھیجنے کے لیے کہا۔ بدنام نظر نے کئی غزلیں بھیجیں اور وہ ''استعارہ'' میں شائع ہوئیں۔ اس طرح وہ پھر سے فعال ہوگئے اور ان کی غزلیں رسالوں میں شائع ہونے لگیں، پھر میں گیا آ گیا۔ بدنام نظر بیٹا بیٹی دونوں کی شادی کرچکے تھے۔ اکثر وہ بیٹی کے پاس گیا آتے اور مہینوں گیا میں رہتے۔ اس طرح پھر سے ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ پیشا النظر نے ان کی تمام غزلوں کو یکجا کرکے ''گراس روٹس انڈیا پبلی کیشن'' کو دے دیا اور ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''نزول'' کے نام سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

اندھیروں میں خود اپنے آپ سے ڈر جاؤ گے بدنام
نزولِ شام سے پہلے نظر میں روشنی بھرلو

پبلشر نے یہ مجموعہ قومی کونسل میں تھوک خریداری کے لئے جمع کیا۔ وہاں سے ۵۷۰ کاپی کی منظوری بھی مل گئی پبلشر نے کتابیں جمع کرادیں، مگر لین دین میں بدنام نظر اور پبلشر سے نااتفاقی ہوگئی، اس لیے بدنام نظر کو اس کی اتنی کاپیاں نہیں ملیں جتنی دینے کی بات تھی اس طرح یہ کتاب بہت سے لوگوں تک نہیں پہنچ پائی۔

بدنام نظر نے بہت تیزی سے لکھنا شروع کیا اب وہ شاعری کے ساتھ مضامین بھی لکھنے لگے۔ جب کافی غزلیں جمع ہوگئیں تو میں نے قومی کونسل میں جمع کروادیا۔ وہاں سے مسودہ منظور بھی ہوگیا اور وہ کتاب منظر عام پر آگئی جس کا نام ''بارگراں'' ہے۔ یہ ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی اس کتاب کو انہوں نے دل کھول کر بانٹا۔ اس طرح ایک بار پھر بدنام نظر لائم لائٹ میں آگئے اور جو لوگ ان کو بھول گئے تھے ان کی شاعری پر بات کرنے لگے۔

۲۰۲۳ء میں انہوں نے اپنا چوتھا مجموعہ ترتیب دیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ میں جمع کروادیا۔ ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہو پایا ہے۔ کوشش کروں گا کہ کسی طرح یہ مجموعہ شائع ہوجائے۔

بدنام نظر کورونا کے چپیٹ میں آگئے تھے۔ بیٹا اور بہو نے دلی میں علاج کرایا، مگر ان کا کہنا تھا کہ اسی وقت ان کا ایک لنگس خراب

ہوگیا تھا، پھر انہیں نمونیہ ہوگیا اور ہارٹ پرابلم بھی، اس طرح ان کا دوسرا لنگس متاثر ہوگیا۔ بات کرتے کرتے وہ کھانسنے لگتے، ہمیشہ گرم پانی پیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ میرے گھر آجاتے اور گھنٹوں ادب پر گفتگو کرتے۔ جب ان کا دل گھبراتا فون کرتے کہ ''گھر آجاؤ'' میں چلا جاتا۔

ایک دن وہ مجھے لے کر منصور رضا کے پاس گئے ان کی دونوں کتابیں انہوں نے ہی کمپوز کیا تھا اور دو کتابیں کمپوز ہو رہی تھیں ایک جو انہوں نے مضامین لکھے تھے اور دوسری جوان کی شاعری کے حوالے سے مضامین لکھے گئے تھے۔ بدنام نظر نے منصور رضا سے کہا:

''اگر میں مرگیا تو ان دونوں کتابوں کے مالک احمد صغیر ہوں گے۔ آپ یہ کتابیں ان کے حوالے کر دیجئے گا۔ جتنے صفحات آپ نے کمپوز کئے ہیں ان کے پیسے میں نے ادا کر دیا ہے باقی جو رہے، آپ احمد صغیر سے لے لیں گے۔''

ان کی دلی خواہش تھی کہ دونوں کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہو جائیں، لیکن شائع نہیں ہوسکیں۔ انشاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ دونوں کتابیں جلد منظر عام پر آجائیں۔ موت سے تین دن قبل انہوں نے فون کر کے مجھے گھر بلایا اور کہا:

''میرے اوپر دو مضامین میرے واٹس ایپ پر آئے ہیں۔ آپ کسی طرح اسے کمپوز کروا کر میری کتاب میں شامل کر لیں۔''

انہوں نے اپنے نواسے سے کہہ کر میرے واٹس ایپ پر وہ دونوں مضامین بھجوا دیئے۔

اسی رات انہیں ہارٹ اٹیک آیا اور انوگرہ میموریل کالج کے پاس ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں ان کو داخلہ کرایا گیا۔ دوسرے دن مجھے اس کی خبر مل چکی تھی اور میں ملنے کے لیے جانے والا تھا، لیکن کالج میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ دوسرے دن ان کے داماد سے بات ہوئی اور اسی دن عین تابش نے فون کیا کہ میں بدنام نظر سے مل کر آرہا ہوں۔ حالت اچھی نہیں ہے تم جا کر مل لو۔ وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ میں دو پہر دو بجے ان سے ملنے چلا گیا۔ وہاں احسان تابش پہلے سے ہی موجود تھے۔ بدنام نظر کے نواسے نے کہا آپ لوگ بیٹھئے میں کھانا کھا کر آتا ہوں۔ وہ چلا گیا۔ بدنام نظر ہم لوگوں کو ٹکٹکی لگائے صرف دیکھتے رہے۔ وہ بولنا چاہ رہے تھے، لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے، لیکن آکسیجن لگا ہوا تھا۔ وہ جب بھی کوشش کرتے میں انہیں لٹا دیتا۔ بے چینی بڑھ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا اب قریب وقت ہے۔ دو گھنٹے کے بعد ان کی بیٹی اور دونوں نواسی بھی آگئیں۔ میں نے کہا دیکھو بار بار پلس ناپنے والا آلہ نکال رہے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔ ان کی بڑی نواسی انہیں تسلی دیتی رہی اور ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ان کی بیٹی رو رہی تھی میں نے دلاسہ دیا۔ روفی نے بدنام نظر کی بہن کو خبر کر دیا کہ حالت اچھی نہیں ہے۔ بیٹا اور بہو دلی سے چل چکے تھے اور صبح پہنچنے والے تھے۔ بدنام نظر بار بار کچھ کہنا چاہ رہے تھے، لیکن بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ وہاں سے نکل گئے۔

رات میں ان کے داماد کا فون آیا کہ کیا کریں۔ میں نے کہا کہ کہیں بھی لے جانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یشاء النظر صبح پہنچ رہا ہے، اس کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیجئے گا، لیکن یہ پٹنہ بھی جانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں رات بھر بے چین رہا۔ دل اُدھر ہی لگا ہوا تھا۔ رات بھر ان کی یادیں بازگشت کرتی رہیں۔ بس میرا دھیان موبائیل کی طرف لگا رہتا۔ رات کے آخری پہر میں مجھے نیند آگئی۔ صبح سات بجے امانی کا فون آیا کہ نانا نہیں رہے۔ جو حالت میں دیکھ کر آیا تھا مجھے تشویش تھی کہ ایک یا دو دن سے زیادہ نہیں بچیں گے اور وہی ہوا۔ امانی نے بتایا کہ ہم لوگ جنازے کو کنڈا شیخ پورہ لے جا رہے ہیں، ان کی وصیت کے مطابق وہیں دفن کیا جائے گا۔ میں ان کے آخری رسوم میں شامل نہیں ہوسکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اپنی بات ان کی غزل کے ان اشعار پر ختم کر رہا ہوں ؎

سروں سے اونچا کسی کیل پر لگایا ہوا
میں ایک فریم ہوں دیوار پر سجایا ہوا
نہ تیز پانی میں پگھلوں نہ دھوپ میں سوکھوں
نہ جانے کون سی مٹی کا ہوں بنایا ہوا

اب بدنام نظر فریم میں ہی نظر آئیں گے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ آمین!

❁❁❁

ڈاکٹر صابر علی سیوانی

Ho.No. 9-4-87/C/12, First Floor, Behind Moghal Residency,
Toli Chowki, Hyderabad 500008 (TS) (Mob.9989796088)

ظفؔر رانی پوری: کچھ یادیں کچھ باتیں

علاالدین ظفر، ظفؔر رانی پوری ضلع سیوان (بہار) کے کہنہ مشق اور نمائندہ شاعر تھے۔ جدید لب ولہجہ ہی ان کی شاعری کا انفراد تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ذات کا کرب اور تجربات کی ضرب کی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے تجربے بہت کیے اور انہی تجربات کو انھوں نے اپنے شعری پیکر میں ڈھالا۔ ان کی شاعری عام فہم اور عام انسان کے مسائل وموضوعات سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے اگر چہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک مردم بیزار، وفا شعار، خوددار، وضعدار اور دل دار شاعر کو پڑھ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذات میں جو حوادثِ زمانہ اور آزمائشاتِ دنیا سے پیدا شدہ درد، کسک، ٹیس اور گھٹن جیسے عناصر اثر انداز ہوگئے تھے، وہی ان کی شعری تخلیقات میں چھن چھن کر باہر آتے رہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ظفؔر رانی پوری کی شاعری دراصل ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں معاشرے کی حقیقتیں، صداقتیں، لطافتیں، نزاکتیں اور حرارتیں کل بھی دیکھی جاسکتی تھیں اور آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ظفؔر ایک ایسا شاعر تھا جو کسی بھی ادبی تحریک سے وابستہ تو نہ تھا، لیکن اچھی ادبی تحریروں اور معنی خیز شعری تخلیقات سے اسے تحریک ضرور ملتی تھی۔ اس خوش فکر شاعر کے حلقہ احباب میں محض مٹھی بھر لوگ شامل تھے۔ اس نے سب سے الگ تھلگ ایک دنیا بنالی تھی، جو صرف اس کے آبائی مکان اور اس کے اطراف پھول پودوں، درختوں اور بیل بوٹوں کے درمیان محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

یہ شاعر بہت جلد کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چاہنے والوں کی تعداد نہایت محدود رہی۔ وہ مجلسی آدمی نہیں تھا اور نہ ہی شورِ جہاں اسے پسند تھا۔ بقول مرزا غالبؔ ؎

نے تیر کماں میں ہے ، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے ، مجھے آرام بہت ہے

ظفؔر رانی پوری سے راقم السطور کی ملاقات سال ۲۰۱۵ء میں روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد کے دفتر ''دارالسلام'' میں معروف شاعر ڈاکٹر محسنؔ جلگانوی کے توسط سے ہوئی تھی، تب وہ حیدرآباد میں ہی اپنے فرزندان کے پاس مقیم تھے۔ اس کے بعد اکثر وبیشتر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ اپنی شعری تخلیقات سنایا کرتے تھے۔ ان کی غزلیں اور دیگر منظوم تخلیقات سن کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس شاعر کی شاعری میں گہرائی بہت ہے۔ لب ولہجہ بالکل منفرد اور سنانے کا انداز نرالا تھا۔ ان کی شاعری ان کی زبانی سن کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چند ملاقاتوں کے بعد انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''احساس کا سفر'' مجھے دیا۔ ''احساس کا سفر'' ۲۰۱۳ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔

ظفؔر ان دنوں اپنے دوسرے شعری مجموعے کی تیاری میں مصروف تھے، فاؤنٹین پین کی کٹی ہوئی نب انھیں خوش خط تحریر کے لیے مل گئی تھی اور روشنائی کی تلاش میں سرگرداں تھے، لیکن انھیں عمر کے آخری دنوں تک روشنائی نہ مل سکی اور قدرت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنا دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر لاسکیں، اس طرح ان کا شعری سفر محض ''احساس کا سفر'' تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ ان کے احساس کے سفر میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں اور کن کن کٹھنائیوں سے انھیں گزرنا پڑا، ان تمام تجربات کا مرقع ان کے دوسرے شعری مجموعے میں شامل ہونے والا تھا، لیکن اردو ادب کے قارئین ان کے اس سفر کی داستان سننے سے یوں محروم رہ گئے کہ اچانک ان کے قلب پر شدید حملہ ہوا اور ۳۰/جون

۲۰۲۴ء کو پٹنہ کے آئی جی آئی ایم ایس میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک لفظ کی تحریف کے ساتھ ثاقبؔ لکھنوی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے کہ ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
تمہی سوگئے داستاں کہتے کہتے

ممکن ہے کہ اب ان کے فرزندان اپنے والد کے دوسرے شعری مجموعے کو منظر عام پر لائیں۔ اور ہم ان کی دیگر تخلیقات سے استفادہ کرسکیں۔

ظفرؔ رانی پوری ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء میں رانی پور بستی، ضلع سیوان میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ بستی ہے جہاں سے ڈاکٹر ظفرؔ کمالی اور پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ اور معروف انشائیہ نگار جناب جہانگیر انس کا تعلق ہے۔ ظفرؔ صاحب کی ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں ہوئی اور بڑہریا ہائی اسکول (ضلع سیوان) سے انھوں نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اسکول میں ہی اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی کی بھی شد بد رکھتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی یا کسی کالج سے کوئی اعلیٰ ڈگری تو حاصل نہیں کی، لیکن اپنے تینوں فرزندان اور اپنی اکلوتی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی، جو ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

بزنس کے سلسلے میں ظفر رانی پوری برسوں سمستی پور (بہار) میں مقیم رہے۔ اس دوران ان کا تخلیقی سفر بھی جاری تھا۔ ان کی شعری تخلیقات ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں شائع ہوتی تھیں۔ ماہنامہ ''شاعر'' کے بہت سے شمارے انھوں نے جلد سازی کراکے اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ کر رکھا ہے۔ کتابوں کا بہترین ذخیرہ اس لائبریری میں موجود ہے۔ ''شاعر'' کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ سمستی پور میں انھوں نے بہت محنت سے پیسے کمائے اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جب ان کے بچے برسر ملازمت ہوگئے تو انھوں نے اپنے بزنس کو خیرباد کہہ دیا۔ برسوں حیدرآباد میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مقیم رہے، لیکن پھر شہری زندگی انھیں راس نہ آئی تو اپنے آبائی وطن رانی پور چلے گئے اور وہیں اپنے کتب بینی کے شوق کو پروان چڑھانے اور پھول پتیوں کی آبیاری اور شجر کاری کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داری میں مصروف ہوگئے۔ باغبانی کا انھیں بے حد شوق تھا۔ فطری مناظر انھیں پسند تھے۔ شوروغل اور گاؤں کی سیاست انھیں پسند نہیں تھی، اس لیے انھوں نے بقیہ زندگی گوشہ نشینی میں گزاری۔

ظفرؔ رانی پوری کے قیامِ حیدرآباد کے دنوں میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد میں ان کی شعری تخلیقات نہایت پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر محسنؔ جلگانوی کے توسط سے جناب عابد صدیقی مرحوم کے دولت خانہ قادر باغ، حیدرآباد میں ظفرؔ صاحب کے اعزاز میں ایک تہنیتی تقریب اگست ۲۰۱۵ء میں منعقد ہوئی تھی، جس میں راقم الحروف نے ان کی شخصیت اور فن پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ وہ مضمون روزنامہ ''اعتماد'' کے ادبی صفحہ ''اوراقِ ادب'' میں ۱۷ اگست ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا تھا۔

وہ مجھ سے اکثر فون پر دیر تک باتیں کیا کرتے تھے۔ رانی پور اور ضلع سیوان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق مجھے بتایا کرتے تھے۔ مجھے بے لوث چاہنے والوں میں عالمی شہرت یافتہ مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین اور دوسرے ظفرؔ رانی پوری تھے، لیکن افسوس ان دونوں کے سایۂ عاطفت سے میں محروم ہوگیا۔

شعر گوئی کا فن ظفرؔ رانی پوری کو وراثت میں ملا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرے خاندان میں جو ادبی روایت چلی آرہی ہے، وہ دو سو سال پرانی ہے۔ ان کے پردادا مظفر حسین منوؔر اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ وہ باتیں بھی فارسی زبان میں کیا کرتے تھے۔ مظفر حسین منوؔر کی ایک مشہور مثنوی ''مثنوی تواریخ روم'' کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ ''مثنوی تواریخ روم'' ۱۹۱۰ء میں سیالکوٹ (پاکستان) سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ ظفر صاحب کے دادا غیاث الدین احمد برقؔ کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ وہ اپنے عہد کے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن ابھی تک ان کا کلام منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ ''تذکرہ شعرائے سارن'' (مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص ۲۸۳) میں سمیع بہواروی نے ان کے والد کا نام انیس الرحمٰن بتایا ہے، لیکن اس سے زیادہ ان کے متعلق راقم الحروف کو کچھ علم نہیں کہ وہ کس پیشے سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد کی ایک کتاب ''سیوان کی ادبی تاریخ'' حال ہی میں (۲۰۲۴ء) میں چھپی ہے، جس میں ظفرؔ رانی پوری کا مختصراً ذکر ہے اور ان کے چار اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ماہنامہ ''زبان وادب''، پٹنہ کے فروری ۲۰۲۴ء کے شمارے میں

ظفؔر رانی پوری کی دوغزلیں صفحہ۵۳ پر شائع ہوئی ہیں اور مئی ۲۰۲۴ء کے شمارے میں بھی ان کی ایک غزل اور ایک خط شامل ہے۔

ظفؔر رانی پوری کا آبائی گاؤں جوان کے نام کا حصہ بن چکا ہے، ابتدا سے ہی ادبا اور شعرا کی آماجگاہ رہا ہے۔ وہ اپنے آباواجداد کی وراثت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ جدید لب ولہجہ کے شاعر تو ضرور تھے، لیکن کلاسیکی شاعری کی روایت کی پاسداری کو بھی انھوں نے شعر وسخن کے لیے لازمی قرار دیا تھا۔ بقول ظفؔر ؎

یہ لب و لہجہ ، یہ جدت ، پسند ہے میری
مگر یہ سچ ہے سرے سے روایتی ہوں میں

انہیں اپنے بزرگوں کی علمی اور ادبی وراثت بہت عزیز تھی اور اسے ایک امانت کے طور پر سنبھالے رکھنے کی بات خود اپنے ایک شعر میں کہی ہے ؎

نقوش ان کے قدم کی امانتیں ہیں مری
بزرگ جو بھی مرے خاندان سے گزرے

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے صرف کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ عملاً اس ارض علم وسخن کی آبیاری میں نہایت خلوص اور عمدگی سے حصہ لیا ہے۔ اگرچہ ان کا صرف ایک مجموعہ کلام اُن کی زندگی میں شائع ہوسکا ہے، لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر نہیں کہ ظفؔر کی شاعری واقعی ''احساس کا سفر'' ہے، ایک ایسا سفر جس میں شاعر اپنے قاری کو بھی ہمہ دم اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے اور فکر وفن کی اَن گنت وادیوں میں لے جاتا ہے۔

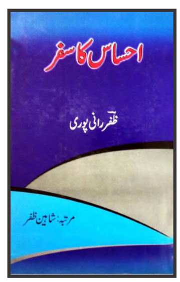

ظفؔر صاحب کو شعر گوئی کا فن آتا تھا۔ لفظوں کا انتخاب نہایت ہنرمندی سے کرتے تھے۔ آسان زبان میں شعر کہنے کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ وہ ایک ذہین اور حساس شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی محسوس کیا، برملا اس کا اپنی تخلیقات میں اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام میں نہایت برجستگی پائی جاتی ہے۔ وہ مصلحت پسند سخنور نہیں تھے اور نہ ہی کسی سے مرعوب ہونا جانتے تھے۔ ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں ضرب المثل بننے کی خصوصیات موجود ہیں۔ گوشہ نشینی اور کم مردم آمیزی کے باعث انھیں اتنی شہرت نہ مل سکی، جس کے وہ حقدار تھے۔ اس میں ان کی انانیت کو بھی دخل ہے۔ ان کی خودداری میں انا کا پہلو غالب تھا۔ اس کی عکاسی ان کے اشعار میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ظفؔر رانی پوری کا یہ سہل ممتنع کا حامل شعر ملاحظہ ہو جس میں برجستگی اور روانی کی انتہا نظر آتی ہے ؎

چلو یہ فیصلہ اچھا ہوا ہے
نہ میں اس کا، نہ وہ میرا ہوا ہے

بیشک ان کے متعدد اشعار میں سلاست ہے، روانی ہے، فکر کی تابانی ہے اور مختصر بحر میں کہے گئے ان کے اشعار میں جولانی ہے۔ تجربات کی ایک دنیا درج ذیل اشعار میں بھی دیکھی جاسکتی ہے، جو چھوٹی بحر میں ہیں ؎

کچھ اپنی بھی خبر لیتا چلوں میں
مجھے خود سے ملے عرصہ ہوا ہے

کھولیے مت دلوں کے دروازے
رازداں رازداں نہیں ہوتا

اس سے ملنے کی کوئی بات ہے کیا
میرے حصے میں کائنات ہے کیا
خامشی چیختی ہے سڑکوں پر
پھر نئی کوئی واردات ہے کیا
زندگی ہو تو اک اصول بھی ہو
ورنہ پھر مقصد حیات ہے کیا

میں اب اندر ہی اندر ٹوٹتا ہوں
خموشی میری فطرت ہوگئی ہے

اصول پسندی، وضع داری، خودداری، اعلیٰ ظرفی اور اعتبار واعتماد کی باتیں ان کی شاعری کا جزوِ لاینفک قرار دی جاسکتی ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی انا، اصول پسندی، رکھ رکھاؤ اور عزم وحوصلہ کو بھی اپنے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف اخلاق ومروت اور پند ونصیحت کی باتیں ان کی شاعری کا حصہ بنی ہیں، بلکہ انھوں نے عشق ومحبت، رومانیت اور دلی جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے ؎

کرم اس کا ہے، میں اس کی نگہبانی میں رہتا ہوں
میں کاغذ کا بدن رکھتے ہوئے، پانی میں رہتا ہوں
کسی کی آنکھ نہ ٹھہرے تو پھر میری خطا کیا ہے
میں سورج ہوں، ہمیشہ اپنی تابانی میں رہتا ہوں

ہر اک نگاہ ٹھہرتی کہاں ہے سورج پر
ہر اک نظر کو کہاں ہم قبول کرتے ہیں

رومان پروری کے دامن کو بھی ظفؔر صاحب نے وسعت دینے کی کوشش کی ہے، بلاشبہ یہ اشعار ان کی رومانی شاعری کا اہم حصہ کہلانے کا حق رکھتے ہیں جن میں یادوں اور تمناؤں کا ایک جہاں آباد ہے اور ساتھ ہی ساتھ حسن ظن کا ایقانی اظہار بھی ۔

تمام رات کی خوشبو گلاب میں رکھ دوں
میں چاہتا ہوں تجھے اپنے خواب میں رکھ دوں
کرن جو پھوٹے تو خوشبو تری بکھر جائے
اگر اٹھا کے تجھے آفتاب میں رکھ دوں

پڑھو تو آج بھی ہر لفظ سے خوشبو آئے
کچھ ایسے خط مری بوسیدہ الماری سے نکلے ہیں

بہار ، پھول ، شفق ، چاند ستارے لے کر
ہم ترے حسن کی خیرات کرتے رہتے ہیں

تجرباتِ دنیا سے جو کچھ ظفؔر نے سیکھا، اسے ہم تک پہنچایا ہے ۔ یہ تجربات شیریں کم، تلخ زیادہ ہیں ۔ اپنوں سے جو زخم ملے، غیروں نے جو درد دیئے اور ان سب کے اثر سے وہ ٹوٹ کر کیسے بکھرے، ان تمام داغ ہائے غم کو انھوں نے بڑے خوبصورت لہجے میں پیش کرتے ہوئے عصری حسیت کو بھی شامل کیا ہے ۔

تو نے دیکھا فقط ٹوٹتے پھول کو
ہم نے دیکھا ہے دل ٹوٹ جاتے ہیں

اب کہیں تصویر بھی اپنی نظر آتی نہیں
آئینے جتنے تھے سب کے رنگ کالے ہوگئے

یوں تو کتنے دوست اور احباب رہتے تھے مگر
وقت جب آیا تو سب کافور ہوکر رہ گئے

بکھرے ہیں کیسے بن کے ورق جانتے ہیں ہم
رشتوں کے ٹوٹنے کا قلق جانتے ہیں ہم

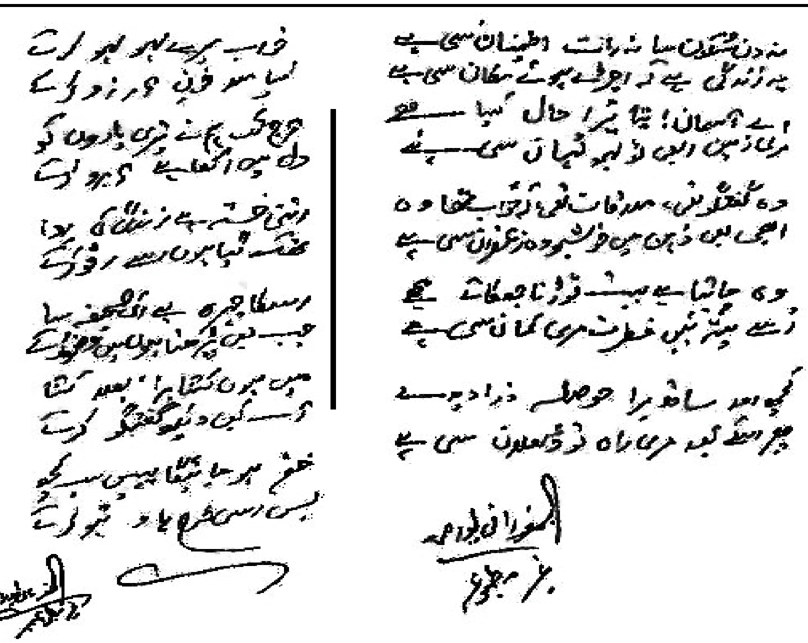

دوغزلیں
به خط شاعر

جناب ظفؔر رانی پوری نے اپنی یہ غزلیں اپنے لیٹر پیڈ پر لکھ کر ''زبان وادب'' میں اشاعت کے لئے ارسال کیا تھا، مگر ہمیں افسوس ہے کہ یہ اُن کی زندگی میں شائع نہ ہوسکیں ۔ (ادارہ)

کیا یوں ہی نہیں یہ فیصلہ گوشہ نشینی کا
ظفؔر کچھ سوچ کر ہم دوستی یاری سے نکلے ہیں

تلمیحی اشعار بھی ظفؔر کی شعری زنبیل میں ملتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ اسلام کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا ۔

یہاں سے بچ کے نکلنے کی کچھ سبیل تو ہو
عصا ہو ہاتھ میں آگے ہمارے نیل تو ہو

قلم فن کار کا جب تک لہو میں تر نہیں ہوتا
وہ اپنے دور کا اس وقت تک آذر نہیں ہوتا

ظفؔر صاحب کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ان کی خواہشیں لامحدود تھیں ۔

زندہ رہنے کی ابھی زندہ ہیں مجھ میں خواہشیں
گہرے پانی میں کوئی شعلہ ابھی روشن سا ہے

بلاشبہ ظفؔر کی شاعری میں بڑی معنویت، گہرائی اور گیرائی کے حامل ہیں۔ یہاں بس انہی کے ایک شعر پر اپنی بات مکمل کرنا چاہتا ہوں کہ ۔

بچ نہ پائے، موت کے آخر نوالے ہوگئے
کیسے کیسے لوگ، مٹی کے حوالے ہوگئے

❀❀❀

راشدانور راشدؔ: یادیں اور باتیں (ص ۳۴سے آگے)

واضح ہو کہ یہ غزل ۲۰۰۷ء میں کہی گئی تھی،لیکن اس غزل کا ہر شعر راشدؔ کے موجودہ حالات پر صادق نظر آتا ہے۔ پہلا شعر ہی دیکھیں کہ راشد اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کس قدر راذیت میں مبتلا رہے جسے انھوں نے کڑی دھوپ کا نام دیا ہے، جس سے گھبرا کر وہ خوش رنگ نظارہ کی تمنا کرتے ہیں۔آخری دنوں کے اذیت ناک لمحات کو سہتے ہوئے اس نے گہرے زخم کی آرزو بھی کی تھی۔غالبؔ نے کہا تھا ۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

غزل کے باقی اشعار بھی راشدؔ کی دلی کیفیات اور ذہنی جذبات کے عکاس ہیں۔ راشد نے ان لوگوں سے جو اس تکلیف سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے،مخاطب ہو کر کہا تھا ۔

اس قدر میری اذیت سے تجھے ہے تکلیف
اتنا بتا دے پھر آگ لگائی کیوں تھی

❀❀❀

تازہ نگارشات مطلوب ھیں

اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے لئے قلم کار حضرات شعری ونثری صنف ادب پر اپنی غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ، تازہ ترین تخلیقات ہمیں ارسال کریں۔آپ کی معیاری ادبی وتنقیدی اور تحقیقی وتخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ آپ کی ایسی تخلیقات کا بھی ہمیں خصوصیت سے انتظار ہے جو اصناف ادب کی تاریخ،اس کے فن پر ہوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا وطالبات کے لئے مفید مطالعہ ہوں۔ہمیں بچوں کے لئے بھی نثری وشعری تخلیقات خصوصاً مختصر مضامین، کہانیاں اور نظمیں مطلوب ہیں۔تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویریں بھی ارسال کریں۔نگارشات صفحہ کے ایک طرف املا وانشا کی غلطیوں سے پاک صاف اور خوش خط لکھی ہوئی ہوں یا صحت وصفائی کے ساتھ کمپوز شدہ ہوں۔ساتھ ہی نام،مکمل پتہ اردو اور انگریزی میں، ڈاکخانہ کا پن کوڈ،اپنے موبائیل کا نمبر بھی لکھیں اور بینک کھاتہ جس نام سے ہے وہ نام، کاؤنٹ نمبر،آئی ایف کوڈ بھی لکھیں۔تخلیقات کے ساتھ غیر مطبوعہ غیر نشر شدہ خاص برائے ''زبان وادب'' لکھنا بھی نہ بھولیں۔تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر کا فیصلہ حتمی ہوگا۔تخلیق کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، زیراکس یا فوٹو اسٹیٹ کاپی نہ بھیجیں۔

مدیر/معاون مدیر''زبان وادب''اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

افسانے

محمد طارق

Inamdar House, Kholapur, Dist Amravati-444802 (Mob.8055503366)

بوجھ

اس کا چہرہ حسین نہیں ہے، لیکن بدصورت بھی نہیں۔ رنگ، سانولا، ناک ستواں، بھوئیں کمانی دار، آنکھیں بڑی بڑی، لانبی پلکوں والی، بال کمر تک جھولتے ہوئے، بدن زیادہ پرشباب نہیں۔

اس کی آنکھوں میں جوانی کا البیلا پن نہ شوخی نہ شرارت، ہمیشہ اُداسی کے گہرے بادل اس کی پلکوں میں سمائے رہتے ہیں، جس سے اس کا چہرہ غمزدہ لگتا ہے۔

اس کے لب زندگی کی آہوں سے سوکھ چکے ہیں، جیسے گلاب کی کلی اپنے بطن میں کھلنے کی بے تاب آرزو لیے خزاں کے جھونکوں سے مرجھا جاتی ہے۔ اب تو اس کا بدن بھی رفتہ رفتہ سوکھ رہا ہے، اس درخت کی طرح جس کی جڑ میں گھن لگ جاتا ہے۔

علی الصباح اس کی آنکھیں سوجی سوجی سی رہتی ہیں جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو اور اس کے لباس کی شکن گواہی دیتی ہے کہ یہ رات بھر نہیں سوئی۔ چہرہ زندگی کے درد و کرب کا اظہار کرتا ہے۔

میں نے اس کے لبوں کو عرصے سے مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہاں اس کے لب کانپے ضرور، گلاب کی ایک سوکھی پنکھڑی کی طرح، جو کچھ کہہ نہیں سکتی، صرف ہوا کے جھونکوں سے لرز جاتی ہے۔

اکثر وہ روٹی پکاتے پکاتے خیالوں میں کھو جاتی ہے اور روٹی توے پر جل جاتی ہے۔ برتن مانجھتے مانجھتے اس کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ وہ کچھ سوچتی ہے۔ گھر کے آنگن میں چارپائی پر لیٹے لیٹے خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے، جیسے آسمان میں اس کی نگاہیں چھید کر دیں گی۔

کبھی وہ خاموش اپنا سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھ جاتی ہے اور جب سر اٹھاتی ہے تو اس کی آنکھیں پرنم دکھائی دیتی ہیں۔ میں اس کی آنسوؤں میں بھیگی آنکھوں کو دیکھ کر پراذیت غم میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔

''میں کیا کروں...... کیا کروں میں؟''

اندر ہی اندر میں اپنی بے بسی پر افسوس کرتا رہتا ہوں، اس کی محبت مجھے تڑپاتی ہے۔ میری روح کو بے چین کر دیتی ہے، میں بے قرار ہو جاتا ہوں، مجھے اس سے بے حد پیار ہے، وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔

میں ایک ریٹائرڈ کلرک ہوں۔ مختصر سی پنشن ملنے کی وجہ سے ہم نہایت کفایت شعاری سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کی ماں، جس نے سلیقہ مندی سے گھر چلا کر اپنی بیٹی کے لیے رواج سے مجبور ہو کر تھوڑا سا جہیز جمع کر رکھا تھا اور کچھ پیسے بیٹی کی شادی کے لیے ڈاک خانے کے پاس بک میں جمع کئے تھے۔ ایک دن اپنی بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کی آرزو لیے چل بسی۔

میرا تو اس دنیا میں کوئی نہیں، ہاں! میری بیوی کے رشتے دار ہیں وہ سب میری بیوی کی موت پر گھر آئے تھے۔ عورتیں، مرد سب ان میں میرے پڑوسی بھی شامل تھے، لیکن اب میرے گھر میری بیوی کی موت پر افسوس جتانے والے اس کے سارے رشتے داروں میں سے ایک بھی نہیں آتا، نہ ملنے نہ خیریت پوچھنے۔ میرا اور میری بیٹی کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ وہ تنہا تھی اور میں اکیلا۔

ایک لاچار، بے بس باپ تنہا اور جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکی اکیلی۔ کوئی اسے چاہنے والا نہیں تھا۔ کوئی اسے پسند کرنے والا نہیں تھا...... کیوں نہیں تھا کوئی! آج کے دور میں تو جوان لڑکی کو چاہنے والے بہت سارے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح ابل پڑتے ہیں۔ شاید اس میں میری بیٹی کا ہی قصور ہے، وہ بے حیا نہیں ہے۔ ہمیشہ اوڑھنی، لپٹی، نظریں جھکائے رہتی ہے۔ وہ آنکھوں میں ترچھا کاجل لگا کر تیکھی نظروں سے کسی کی طرف کیوں نہیں دیکھتی۔ دروازے میں کھڑی رہ کر کسی سے عشق لڑانے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔ کب تک مجھ پر بوجھ بنی رہے گی۔ آج میں زندہ ہوں، کل مر گیا تو پھر اس کا کیا

ہوگا؟ میں اس سے کیسے کہوں کہ:

''میری بیٹی! تو نے اپنی زندگی کے آئیڈیل ہم سفر کے لیے جس محبت کا زرتار دوشالہ سنبھال رکھا ہے، وہ کسی بھی مرد کو اوڑھا دے۔ انتظار مت کر کہ تیرے لیے کوئی ایسا رشتہ آئے گا جو جہیز کا لالچی نہ ہوگا۔''

مگر میں یہ کیسے کہوں؟ کاش! میں اس کا باپ نہ ہوتا۔

وقت گزر رہا ہے، دھیمے دھیمے کچھوے کی چال سے۔ جیٹ کے پر لگا کر زن سے پل بھر میں، پلک جھپکتے ہی وقت کیوں نہیں گزر جاتا۔ دنیا فنا کیوں نہیں ہو جاتی۔ فنا...... سب کچھ فنا، کیوں کہ زندگی گزارنا ایک مشکل امر ہو چکا ہے۔

آج میری بیٹی کو بھی شاید اس کا احساس ہو گیا ہے۔ لگتا ہے وہ بھی مایوس ہوگئی، اسی لیے تو بالوں کو نئے انداز سے سنوار کر، میک اپ کر کے دروازے میں جا کر کھڑی ہوگئی۔

میں اپنے دل میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا ہوں، کیا نام دوں میں اس مسرت کو......؟

میرا تصور دل سے مخاطب تھا۔ ایک جوان لڑکی کی زلفیں عشق کی راہ پر گھٹائیں بن جاتی ہیں یا کوہسار کی تہہ بہ تہہ گرتی ہوئی شام، نگاہیں تیر بن جاتی ہیں اور ادائیں زنجیر، کوئی اس تیر سے گھائل ہو کر زنجیر میں جکڑا چلا آتا ہے۔ وہ لڑکی اسے مرمریں مجسمہ لگتی ہے۔ زندگی کا امرت، جیون کی سچائی، وہ اس کے چرنوں میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہوگا میری بیٹی کے ساتھ بھی اور ایک بوجھ میرے سر سے اتر جائے گا۔ اس کی زندگی میں بہار آجائے گی، دل کے آنگن میں پھول مسکرائیں گے، آنکھوں میں زندگی کی چمک جاگ اٹھے گی، لب ہمیشہ متبسم رہیں گے، ایک کھلتی ہوئی کلی کی طرح۔

میری بیٹی کا بن سنور کر دروازے کے پٹ کھول کر دیر تک کھڑا رہنا رائیگاں نہیں گیا۔ میں نے چھپ کر دیکھا۔ ایک جوان مرد پینٹ اور بوشرٹ میں ملبوس میرے گھر کے سامنے سے دن میں بار ہا سائیکل پر ٹن ٹن گھنٹی بجاتے ہوئے گزرتا تھا اور میری بیٹی کو دیکھ کر اسے تبسم کا تحفہ بھی پیش کر دیتا تھا۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اس کا تحفہ قبول کر لیتی تھی۔ ایسا چند دنوں تک چلتا رہا، پھر وہ سائیکل روک کر میری بیٹی سے بات چیت کرنے لگا تھا۔ چوکھٹ کے اندر میری بیٹی اور باہر وہ۔ دونوں مختصر وقت سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرتے، پھر وہ چلا جاتا اور میری بیٹی گھر میں مسکراتی ہوئی آجاتی۔

وہ گھر میں کیوں نہیں آتا، میری بیٹی اسے گھر میں کیوں نہیں بلاتی؟ شاید دونوں میرا الحاظ رکھتے ہوں گے۔ مجھے ہی کہنا پڑے گا کہ بیٹی سائیکل والے اپنے دوست کو گھر میں بلا لیا کرو۔

ایک دن میں نے کہہ ہی دیا۔ اس دن کے بعد سے ہی وہ بے تکلف گھر میں آجاتا تھا۔ آنے سے پہلے وہ سائیکل کی گھنٹی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتا۔ گھنٹی کی آواز سن کر میری بیٹی کی رگ رگ میں جیسے بجلی سی دوڑ جاتی وہ لپک کر اٹھتی اور دوڑتے ہوئے جا کر دروازہ کھول دیتی۔ وہ مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہو جاتا۔

پہلی بار جب وہ گھر میں آیا تھا تب میری بیٹی نے اس کا تعارف کرایا تھا۔ جس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی فرم میں کلرک ہے اور ایک شریف، عزت دار گھرانے کا فرد۔ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی اور میں اپنے سر کا بوجھ ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ میری بیٹی نے اپنا ہم سفر تلاش کر لیا۔ اب اس کی زندگی میں بہار آگئی ہے، اس کے خواب پورے ہو جائیں گے، یہ سوچ کر میں بے انتہا مسرور و سرشار رہنے لگا تھا۔

وہ بلا ناغہ میری بیٹی سے ملنے آتا تھا، جب بھی وہ آتا، میں گھر سے یہ خیال کر کے نکل جاتا کہ ان کی پیار بھری باتوں میں عشق کے سپنوں میں، مستقبل کے رنگین خوابوں کی تعمیر میں خلل نہ آئے، وہ کبھی نہ ٹوٹنے والے وعدے کر سکیں۔ ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے۔

میری بیٹی کے لبوں پر چھایا تبسم، اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی دمک مجھ سے بتا رہی تھی کہ ہم نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا لی ہے، اسی لیے تو وہ اس کا بے تابی سے انتظار کرتی دکھائی دیتی ہے۔

آج وہ نہیں آیا۔ میری بیٹی دن بھر بیقرار رہی۔ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ میں بھی بے چین تھا۔ مجھے بھی نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن وہ گھر سے پریشان نکلی اور میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا:

''بیٹی کہاں جا رہی ہو...... کہاں جا رہی ہو بیٹی؟''

(بقیہ ص ۵۱ پر)

احمد ریاض
Beside SBI, S.N.P. Area Sakchi, Jamshedpur - 831001 (Mob. 9570124858)

رنگ

نند پور گاؤں کے چمار ٹولے میں جب پھلوا چمارن کے بیٹا پیدا ہوا تو لوگوں کو اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ بچہ نریش کمار سنگھ پر گیا ہے، کیوں کہ اس کے نین نقش بالکل ان ہی کے جیسے تھے۔ البتہ اس کا رنگ چماروں کی طرح کالا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اس لئے کہ پھلوا ایک طرح دار اور جوان عورت تھی۔ اس کا رنگ بھلے ہی کالا تھا، مگر اس میں ایک نسوانی کشش تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ نریش کمار سنگھ کی منظورِ نظر تھی۔

اونچی ذات کی اکثریت والا یہ گاؤں ملک کے دوسرے گاؤں کی طرح روایتی طور پر اسی نقشے پر بسایا گیا تھا، جسے ہزاروں سال پہلے منومہاراج نے کھینچ دیا تھا۔ یعنی گاؤں کے مرکز میں برہمن، اس کے ارد گرد راجپوت اور اس بعد شودر جاتیاں۔ گاؤں سے کچھ ہٹ کر چمار ٹولہ بسایا گیا تھا، جن کی جھونپڑیاں گھاس پھوس کی تھیں۔ چماروں کی زندگی کا انحصار اعلیٰ ذات والوں پر تھا۔ ان کے مرد اور عورتیں ان کے کھیتوں میں کمر توڑ کام کرتے، اس کے عوض انہیں اناج کی شکل میں اتنی ہی مزدوری دی جاتی جس سے بہ مشکل ان کا پیٹ بھرتا۔ ان کی عورتوں کا جنسی استحصال عام بات تھی، وہ اچھوت ضرور تھیں، مگر ان کا جسم جنسی ضرورت پوری کرنے کے لئے پاک تھا، اس سے اعلیٰ ذات کے لوگوں کی سماجی حیثیت متاثر نہیں ہوتی تھی۔

پھلوا نریش کمار سنگھ کے باڑے میں جانوروں کو چارا پانی دینے کا کام کرتی تھی۔ اس کا بیٹا کرما چمار جب کچھ بڑا ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ اس کا شوہر عرصے سے بیمار پڑا ہوا تھا اور کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا۔ کرما چمار حویلی کے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتا تو اس کا بھی ان کے ساتھ کھیلنے کا من کرتا، مگر وہ اونچی ذات کے بچے اس نیچ ذات کو اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے، بلکہ بات بے بات اس کی پٹائی بھی کر دیتے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

کرما جب کچھ بڑا ہوا تو وہ بھی حسب دستور حویلی کی خدمتگاری میں لگ گیا۔ نریش کمار سنگھ نے پتا نہیں کیوں اسے اتنی رعایت دی تھی کہ وہ کسی کام سے حویلی کے اندر جا سکتا تھا، مگر پوجا گھر اور رسوئی گھر میں جانے کی مناہی تھی، کیوں کہ وہ تھا تو اچھوت ہی۔ ایک بار بھولے سے وہ رسوئی گھر میں چلا گیا تھا جسے نریش کمار سنگھ کی بیٹی سنگیتا نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کرما کی شکایت کر دی۔ اس پر اس کی خوب پٹائی ہوئی اور رسوئی گھر کی کنواری گائے کے گوبر سے لیپ کر صفائی کی گئی۔ کرما نے اس پٹائی کے درد کو نہ صرف اپنے جسم پر بلکہ دل پر بھی محسوس کیا جو اسے کچوکے لگا تا رہا۔

نریش کمار سنگھ علاقے کے بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ان کی نہ صرف سماجی حیثیت تھی بلکہ سیاست میں بھی عمل دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ڈیوڑھی پر ہر طرح کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ ان دنوں ریاستی اسمبلی کے انتخابات کی گہما گہمی تھی، اس لئے روزانہ ہی میٹنگ سٹنگ کا دور چلتا رہتا۔ کرما ان میٹنگوں میں ہونے والی بات چیت کو آتے جاتے سنتا اور کچھ سمجھتا بھی تھا۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں کرما نے ایک نیتا جی کو کہتے سنا: ''مشکل یہ ہے کہ پہلے ہم چماروں اور نیچ ذات کے لوگوں کو پولنگ بوتھ سے مار پیٹ کر بھگا دیتے تھے، مگر اب ہر گاؤں میں پولنگ بوتھ ہو گیا ہے۔'' اس پر سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کاٹ کیسے کی جائے۔ اس پر ایک صاحب نے، جن کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ تھا، مشورہ دیا:

''گھبرانے کی ضرورت نہیں......ہمیں ان کے درمیان جا کر سمجھانا چاہئے کہ بھلے ہی ہماری ذات الگ الگ ہے، مگر ہم ایک ہی دھرم کے ماننے والے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں......جو بھی

ہمارے درمیان ذات پات کی بنیاد پر پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرے گا، اس کو ہم ووٹ نہیں دیں گے۔''

اس تجویز پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ کرما نے جوان کی باتیں سن رہا تھا، من میں کہا یہ سب پھسلانے کی باتیں ہیں۔ الیکشن کے بعد اچھوت اچھوت ہی رہے گا۔

ایک ہفتے بعد الیکشن کا ہنگامہ ختم ہوگیا اور ویسا ہی رزلٹ آیا جیسا کہ اونچی ذات والوں کا خدشہ تھا۔ یعنی ابھے پانڈے الیکشن ہار گیا۔ اس کے بعد نریش کمار سنگھ کی حویلی پر سناٹا پسر گیا۔ اگلے ہی ہفتے وہ اپنی جسمانی اور ذہنی تکان دور کرنے کے لئے اپنے بیٹے کے پاس پونے چلے گئے، جہاں وہ ایک بینک میں منیجر تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ جاتے وقت انہوں نے کرما چمار کو حکم دیا کہ وہ اب رات کو چمار ٹولے نہیں جائے گا بلکہ یہیں باڑے میں چارا رکھنے کی جو جگہ ہے، وہیں سورہے گا۔ اب حویلی میں صرف عورتیں رہ گئی تھیں یا مرد کی صورت میں صرف کرما چمار، جس کے ذمے حویلی کی دیکھ ریکھ آ گئی تھی۔

نریش کمار سنگھ کے پونے جانے کے چند روز بعد، ایک دن شام سے کچھ پہلے کرما جب کھیتوں سے لوٹ رہا تھا تو ڈیوڑھی پر ایک کار آکر رکی۔ تھوڑی دیر بعد کار سے ایک مرد اور ایک عورت اترے۔ یہ نریش کمار سنگھ کی بیٹی سنگیتا اور داماد اجے سنگھ تھے۔ کرما نے سنگیتا اور اجے سنگھ کی پاؤں لگی کی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ سنگیتا ایک نظر کرما پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی:

''ارے کرما، تم تو پورے جوان ہوگئے ہو۔''

کرما سنگیتا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ نہ کرسکا، مگر اسے خوشی ہوئی کہ آج سنگیتا نے اس سے بات کی، ورنہ اسے اپنی اونچی ذات کا اتنا غرور تھا کہ وہ کبھی کرما سے بات کرنا گوارہ نہ کرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں حویلی سے عورتیں باہر نکلیں اور سنگیتا اور اس کے شوہر اجے سنگھ کو حویلی کے اندر لے گئیں۔

سنگیتا کا شوہر دو دن رہ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اب چونکہ مرد کی صورت میں کرما ہی رہ گیا تھا، اس لئے حویلی کی عورتیں اپنی چھوٹی بڑی ضرورتوں کے لئے کرما ہی کو پکارتی تھیں۔ اب اسے حویلی کے اندر آنے جانے پر کوئی روک نہیں تھی۔ اس بار اس نے اپنے تئیں سنگیتا کے رویے میں بھی تبدیلی دیکھی۔ وہ کرما سے کچھ باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ کرما کبھی کبھی اس کی طرف کن انکھیوں سے نظر بھی ڈال لیتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سنگیتا اب بھی خوبصورت ہے، مگر اس کے چہرے پر انجان سی اداسی کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ شاید اسے کوئی غم ہے جسے اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ کرما کو اس کی وجہ جانتے دیر نہ لگی۔ سنگیتا کی تین سال قبل شادی ہوئی تھی، مگر وہ اب تک اولاد سے محروم تھی۔ سسرال والوں کے طعنوں سے وہ تنگ آ گئی تھی اور اسی وجہ کر وہ اس بار ناراض ہوکر میکے چلی آئی تھی۔ کرما کی چھٹی حس نے آگاہی دے دی تھی کہ سنگیتا اس سے بات چیت کرنا چاہتی ہے۔ کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب آنا چاہتی ہے تاکہ اس کی اداسی دور ہو اور اس کا غم ہلکا ہو۔

ایک شام جب کرما کھیت سے لوٹ کر باہر لگے نل پر ہاتھ پاؤں دھو رہا تھا تو وہ حویلی کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی اور اس کے جوان گٹھیلے جسم پر عجیب سی نظر ڈالتے ہوئے بولی:

''کرما! تم کتنی محنت کرتے ہو......!''

''محنت تو کرنا ہی پڑتا ہے سنگیتا دیدی۔''

اس نے گمچھے سے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

وہ سنگیتا کو دیدی ہی کہا کرتا تھا، کیوں کہ سنگیتا اس سے عمر میں تین چار سال بڑی تھی۔

''اتنے سارے مزدور مالک کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں...... مجھے ہی ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔''

''اچھا! گویا پاپا نے تم کو منیجر بنادیا ہے۔''

''نہیں دیدی، وہ میرے مائی باپ ہیں۔'' اس نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔

ان دنوں کبھی کبھار سنگیتا جانوروں کے باڑے میں آجاتی، جہاں کرما جانوروں کو چارا پانی ڈال رہا ہوتا یا باڑے کی صفائی کررہا ہوتا۔ سنگیتا اس کے قریب آکر ہر طرح کی باتیں کرتی۔ ایسے ہی ایک دن اس نے کرما سے پوچھ لیا: ''کرما! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

(بقیہ ص ۴۹ پر)

امتیاز غدر

"Salim House" Shaheed Gadda, Purana Bazar, Gomoh, Dhanbad - 828401 (Mob. 7033265265)

ماں کا شکم

''ہاں سر......!'' انوراگ کو لگا کہ کچھ لمحوں کے لئے وہ کسی دوسری دنیا میں چلا گیا تھا۔ اب جب کہ حاضری کے لئے اس کا نام پکارا گیا تو اس نے چونک کر اپنی حاضری کے لئے آواز لگائی۔

''دیکھو، میری پالی میں آپ لوگ کل گیارہ آدمی ہو۔ سب لوگ اچھی طرح سے ٹوپی، بیلٹ پہن لیں گے۔ ساتھ ہی ٹوپی کے اگلے حصے میں لائٹ لگا کر اس کی بیٹری کو کمر میں بیلٹ کے ساتھ لگا لیں گے۔ جیسا کہ ٹریننگ کے وقت بتایا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں پھر دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ ڈولی (لفٹ) میں سوار ہونے سے لے کر پھر ڈولی سے اسی جگہ اترنے تک میرے ایک ایک حکم کو ماننا لازمی ہے۔ اگر آپ میں سے کسی نے بھی کسی بھی طرح کی لاپرواہی کی اور خدانخواستہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا تو اس کی ساری ذمہ داری آپ کی خود کی ہوگی۔''

کچھ لمحوں بعد سبھی افراد سردار کے ہمراہ ڈولی میں سوار ہو چکے تھے۔ ڈولی مین جس کا ذمہ اُسے کنٹرول کرنے کا تھا، وہ ڈولی کے دروازے کو اچھی طرح ہلا ہلا کر بند کرنے لگا۔

کوئلہ کھدانوں سے کوئلہ نکالنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک اوپن کھدان جو اب رائج ہو گیا ہے۔ اس میں زمین کی سطح سے ہی بے کار مٹی کو الگ کر کے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ جیوں جیوں کوئلے کی تہیں نیچے ہوتی جاتی ہیں، گڈھا بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ ایسے کھدانوں میں زیادہ تر کام مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئلہ کاٹنے والے مزدوروں کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے، لیکن یہ اوپن کھدان ہر جگہ ممکن نہیں ہے اور جہاں یہ ممکن نہیں ہوتا، وہاں سرنگوں کے ذریعے کوئلے کو مختلف مراحل سے گزار کر زمین کے اوپر لایا جاتا ہے۔ اس میں مزدوروں اور افسروں کی اچھی خاصی ضرورت پڑتی ہے۔ سینکڑوں فٹ زمین کے نیچے بنے سرنگوں تک پہنچنے کے لئے زمین کی سطح سے سیدھے اندر کے سرنگ تک کی رسائی کے لئے اس کے دہانے کے ٹھیک اوپر کنواں نما ایک سرنگ بنایا جاتا ہے۔ جہاں مشین کے ذریعے چلنے والی لفٹ جسے کولیری کی زبان میں ''ڈولی'' کہا جاتا ہے، زمین کے اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر لگاتار آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کے ذریعے مزدوروں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی ٹرالیوں میں بھرا کوئلہ بھی سرنگ سے اوپر آتا ہے اور خالی ٹرالی نیچے جاتی ہے۔ یہ عمل آٹھ آٹھ گھنٹوں کی تینوں پالیوں میں لگاتار دہرایا جاتا ہے۔

ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ ڈولی اسٹارٹ ہوئی اور آن کی آن میں سینکڑوں فٹ زمین کے نیچے جا کر رُک گئی۔ سردار نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''سب سے پہلے میں اتروں گا۔ اس کے بعد میرے تعاقب میں باقی ایک ایک کر کے آئیں گے۔''

انوراگ کے ساتھ ساتھ باقی لوگوں کے لئے بھی یہ پُراسرار دنیا تھی۔ وہاں پہلے ہی سے کچھ لوگ اوپر آنے کی خاطر ڈولی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان لوگوں کے اُترنے کے فوراً بعد وہاں انتظار کرنے والے سارے لوگ ڈولی پر سوار ہو کر سطح پر جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

اندر سرنگ میں رات کا سا سماں تھا۔ جگہ جگہ بجلی کے بلب جگمگا رہے تھے۔ سرنگ بارہ سے پندرہ فٹ کشادہ تھی۔ کہیں اس کی چوڑائی بیس فٹ سے بھی زائد ہو گئی تھی۔ ایک کنارے چھوٹی لائن بچھی ہوئی تھی، جس پر کوئلے سے بھری یا خالی ٹرالیاں آتی جاتی تھیں۔ لوگ جگہ جگہ مختلف کاموں میں مصروف تھے، باہری ہلچل سے ایک دم بے خبر۔

سرنگ کے اندر خوفزدہ ہونے والی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ لوگ وہاں کام نہ کر سکیں۔ ہاں کبھی کبھی کچھ مزدوروں کی غلطیوں کی وجہ سے اور کچھ قدرتی طور پر واقع ہونے والے حادثوں کے علاوہ باقی سب کچھ نارمل رہتا تھا۔ لوگ کہیں کہیں دو چار کی ٹولیوں میں بیٹھے آرام فرماتے

ہوئے ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔

سردار نے چلتے چلتے ہر اس چیز کی جانکاری باقی لوگوں کو دینی شروع کر دی تھی، جو ان کی روز کی ڈیوٹی میں کام آنے والی تھی۔ کہیں کہیں پنجڑوں میں چھوٹی چھوٹی چڑیاں رکھی ہوئی تھیں، جو سرنگ میں متھین گیس کا جو انسان کے لئے بہت نقصان دہ ہوتا ہے، پتا کرنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ خود سردار کے ایک ہاتھ میں ڈیوی کا حفاظتی لیمپ تھا۔ یہ بھی سرنگ میں موجود خطرناک گیس متھین کا پتا لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ آگے چل کر سبھی نے مشاہدہ کیا کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی ٹرالیوں میں لوگ ایک دوسرے کی مدد سے کوئلہ بھرتے ہیں، پھر کچھ لوگ مل کر اسے دھکا دے کر مین لائن تک لاتے ہیں اور اسے تار کے بنے موٹے رسے سے لگا دیتے ہیں، پھر ایک شخص اُس رسے کو مشین کے ذریعے چلا کر ان ٹرالیوں کو کھینچ کر ڈولی تک پہنچاتا ہے، ڈولی کے نزدیک کچھ مزدور پہلے ہی سے تیار رہتے ہیں جو بڑی مستعدی سے ٹرالیوں کو لائین سے اتار کر ڈولی پر رکھتے ہیں پھر اوپر بیٹھے ڈولی مین کو نیچے سے ایک مخصوص الارم کے ذریعے اشارہ دیتے ہیں اور وہ ان ٹرالیوں کو زمین کی سطح پر کھینچ لیتا ہے۔ سردار نے چلتے چلتے ایک جگہ ٹھہر کر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''دیکھو ساتھیو......اب ہم سرنگ کی اصل جگہ کا مشاہدہ کرنے والے ہیں، جسے کولیری کی عام زبان میں فیس کہا جاتا ہے۔ اسی فیس کی دیواروں میں ڈائنامائٹ لگا کر کوئلہ توڑا جاتا ہے، پھر مزدور ٹوٹے ہوئے کوئلوں کو یہیں سے ٹرالیوں میں بھرتے ہیں جسے ابھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ آپ سب یہیں ٹھہریں۔ میں ذرا فیس کا معائنہ کر لیتا ہوں، پھر چلیں گے آگے۔''

سردار تنہا جا کر فیس کا معائنہ کر کے کچھ ہی دیر میں واپس آ گیا، پھر سبھی افراد کو ساتھ لے کر فیس کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں پہلے سے دو تین افراد موجود تھے، جو فیس کی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں ڈائنامائٹ لگا رہے تھے۔ سردار اپنے ساتھ کے افراد کو مخاطب ہو کر جانکاری دیتے ہوئے گویا ہوا:

''ابھی اسی جگہ بلاسٹنگ کرایا جائے گا۔ اس وجہ کر چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں ڈائنامائٹ رکھا جا رہا ہے، پھر آگے کیا ہوگا آپ سب خود مشاہدہ کر لیں گے۔''

سرنگ کے فیس کے قریب پہنچ کر انوراگ کے حواس باختہ ہو گئے تھے، وہ بالکل خاموش سا ہو گیا تھا۔ اسے باہر کی دنیا یاد آنے لگ گئی تھی۔ کس طرح دادی کبھی کبھی پاپا سے کہا کرتی تھی:

''یہ روز روز ماں کے پیٹ میں جانا چھوڑ دو! افسروں کے منھ پر کچھ روپے مارو اور اوپر کہیں خود کو کام پر لگوا لو۔ پیسہ کم ہی ملے کوئی حرج نہیں، جان تو سہی سلامت رہے گی۔''

ماں بھی کبھی کبھی پاپا کو کوئلے سے رنگے ہوئے دیکھ کر کہتی:

''کیوں جی ہم دو روٹی کم کھا لیں گے۔ پیسوں کی لالچ نہ کرو، اوپر ہی کام لگوا لو۔''

لیکن پاپا جانتے تھے کہ انڈر گراؤنڈ الاؤنس کے ساتھ جو تنخواہ ملتی ہے وہ اوپر کام کرنے پر تقریباً آدھی ہو جائے گی، پھر تین تین بیٹیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے جہیز کے لئے پیسے کہاں سے جمع ہوں گے۔ اکلوتے بیٹے کو اچھی اور اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواب ادھورا ہی رہ جائے گا۔ انھیں انڈر گراؤنڈ میں لاحق ہونے والے خطرات اچھی طرح معلوم تھے۔ روز کہیں نہ کہیں کسی کولیری میں کچھ نہ کچھ حادثہ درپیش ہوتا رہتا تھا اور خاص کر انڈر گراؤنڈ میں۔ کمپنی اپنے تئیں پوری کوشش کرتی تھی کہ کسی بھی طرح کا کوئی حادثہ کسی بھی اوپن یا انڈر گراؤنڈ کولیری میں نہ ہو، لیکن پھر بھی کبھی قدرتی طور پر، تو کبھی انسانی غلطی کی وجہ سے کوئی نہ کوئی حادثہ ہو ہی جاتا تھا اور جب کسی بھی طرح کے کسی حادثے کی خبر انوراگ کی ماں اور دادی کو ہوتی، تب دونوں خاص طور پر انوراگ کے پاپا کو لے کر بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ اکثر دونوں دُعائیں کرتی تھیں کہ انوراگ کے پاپا کے ساتھ ایسا کچھ درپیش نہ ہو اور وہ ہمیشہ باحفاظت رہیں، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک دن انوراگ کے پاپا تیسری پالی میں سرنگ میں جو اترے تو پھر صبح ان کی لاش ہی باہر نکلی۔ فیس کے قریب بلاسٹنگ کے بعد سردار کے ذریعے ٹھیک سے معائنہ نہ کرنے کی وجہ کر ٹرالیوں میں کوئلہ لوڈ کرتے وقت بڑا سا کوئلے کا چٹان سات مزدوروں کے اوپر گر پڑا تھا اور

ساتوں کے ساتوں جائے حادثہ پر ہی دم توڑ چکے تھے۔ کولیریوں میں ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ سب سے زیادہ کہرام تو انوراگ کے گھر پر مچا تھا۔ دادی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی تھیں اور پندرہویں دن وہ بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ ماں نے جیسے تیسے اپنے بچوں کی خاطر خود کو سنبھالا تھا۔ اب ماں اور تینوں بہنوں کی ذمہ داری ایک بارگی انوراگ کے نازک کندھوں پر آ گئی تھی۔

پاپا کے گزرنے کے چند مہینوں کے بعد انوراگ کو ان کی جگہ نوکری ملی تھی۔ وہ بھی انڈر گراؤنڈ میں ٹرالی مین کے طور پر۔

اچانک سردار نے سب کو دور جا کر بیٹھ جانے کی ہدایت دی اور کچھ ہی لمحوں بعد یکے بعد دیگرے کئی بلاسٹ فیس پر ہوئے، کچھ لمحوں کے لئے سُرنگ کی زمین تھرتھرا سی گئی۔ انوراگ کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگا ٹریننگ پوری ہونے کے بعد روزانہ اسے اسی سرنگ میں آنا پڑے گا، جو اس کے لئے ایک عذاب سے کم نہ تھا۔

کچھ منٹوں کے بعد سب کچھ معمول میں آ گیا تھا۔ سردار نے اچھی طرح فیس کا معائنہ کر لیا تھا، پھر ڈیوٹی پر تعینات مزدوروں نے بلاسٹ سے اکھٹا ہوئے کوئلوں کو ٹرالیوں میں بھرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ گھنٹے وہاں رُکنے کے بعد سردار پھر اپنے ہمراہ گئے لوگوں کو ساتھ لے کر ڈولی کے ذریعے اوپر پہنچ چکا تھا اور دوسرے دن وقت پر آنے کی ہدایت دے کر سب کو رخصت کر دیا تھا۔

انوراگ نے گھر جا کر اپنی ماں اور بہنوں سے جب اس پرزے کے متعلق اور سرنگ کے حالات بتاتے ہوئے اپنی مرضی ظاہر کی، تب ماں نے اس کے پاپا کے حادثے میں جان بحق ہو جانے کے معاوضے کے طور پر ملے روپیوں کا بنڈل اُس کے ہاتھ میں لا کر تھما دیا۔ ❁❁

رنگ (ص ۴۶ سے آگے)

''شادی......؟ چماروں کی لڑکیوں کی بچپن ہی میں شادی ہو جاتی ہے اور اب میری عمر اٹھارہ انیس سال ہو گئی ہے......میری عمر کی کوئی چمارن بچی ہی نہیں ہے......'' اس نے ہنستے ہوئے مذاق کے انداز میں جواب دیا۔

''تمہیں عورت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟''

سنگیتا کے اس سوال پر کرما چونک گیا۔ اس نے پہلی بار سنگیتا کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی۔ اس کے بعد سنگیتا حویلی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعے کے کئی دن بعد سنگیتا باڑے میں آئی۔ وہ بسنتی رنگ کی ساڑی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ کرما اس وقت مشین سے چارا کاٹ رہا تھا۔ وہ لنگی پہنے ہوئے تھا اور بدن کا اوپری حصہ بالکل ننگا تھا، جس سے اس کے گٹھیلے جسم کے نشیب و فراز نمایاں تھے۔ سنگیتا نے کرما سے اپنے شوہر کا موازنہ کیا اور اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس کے شوہر کا بدن تو بالکل پلپلا تھا۔ سنگیتا کچھ دیر کرما کو چارا کاٹتے دیکھتی رہی پھر بولی:

''کرما، تم رات کو کدھر سوتے ہو......؟''

''اُدھر!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''اس کونے میں پڑ رہتا ہوں جدھر چارا رکھا ہوا ہے۔''

''تمہیں رات کو بھوت پریت سے ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر کاہے کا......بھوت پریت آئے گا تو اسے دبوچ کر پٹک دوں گا۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ سنگیتا کو اس کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی، لیکن وہ اتنا بھولا بھی نہیں تھا۔

اس رات کرما کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات جب گہری ہو گئی تو اسے اپنی جانب آتے ہوئے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا، وہ سنگیتا تھی بسنتی رنگ کی ساڑی میں ملبوس۔ کرما کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا:

''دیدی تم! اتنی رات گئے؟''

''ہاں میں!......میں نے تم پر ایک ظلم کیا تھا، رسوئی گھر میں گھسنے کے جرم میں تم کو پٹوایا تھا......آج اسی کا پرائشچت کرنے آئی ہوں۔'' اس پر دونوں ہنس پڑے۔

کچھ مہینوں بعد سنگیتا کے بیٹا پیدا ہوا تو اس کی شکل و شباہت کرما سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف رنگ کا تھا۔ ❁❁

طنزومزاح

طبیب احسن تابش
Ranchi (Mob. 9534340212)

لیٹ

آپ ''لیٹ'' میں سابقہ کلمات لگا کر بہت سارے الفاظ بناسکتے ہیں، جیسے فلیٹ، سلیٹ، آملیٹ، پلیٹ، چاکلیٹ، بک لیٹ وغیرہ۔ میں یہاں صرف ''لیٹ'' پر ہی گفتگو کروں گا۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بہت کم لوگ ہیں جو اپنا کام وقت پر کرتے ہیں۔ کام میں اکثر ''لیٹ'' ہو ہی جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں بھی ایک دو دن لیٹ کر کے ہی آتا ہے۔ ڈاکٹر جو تاریخ دیتا ہے، اس تاریخ تک بچے کی ولادت نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک دو دن لیٹ بھی ہو جاتا ہے۔ ہسپتال سے چھٹی ملنے میں لیٹ، بچہ جب تھوڑا بڑا ہوا تو اسکول میں داخلہ کرانے میں لیٹ، داخلہ ہو گیا تو بچوں کو اسکول جانے میں لیٹ، اسکول بس ہے تو بس کو آنے میں لیٹ، جب بچہ پڑھ لکھ کر فارغ ہو گیا تو ملازمت ملنے میں لیٹ، ملازمت جب وقت پر نہیں ملی تو شادی میں لیٹ، شادی وقت پر نہیں ہوئی تو بچہ ہونے میں لیٹ۔

گویا جب انسانی زندگی میں کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا تو زندگی کی ترتیب بگڑ جاتی ہے۔ ''لیٹ'' ہماری زندگی میں ایسا رچ بس گیا ہے کہ اس سے باہر نکلنا آسان نظر نہیں آتا۔ ریلوے اسٹیشن جائیں تو ریل لیٹ، بس اسٹینڈ جائیں تو بس لیٹ، محبوبہ سے ملنے جائیں تو محبوبہ لیٹ، آفس کے ملازم آفس پہنچنے میں لیٹ۔

میری بیگم جب کہتی ہیں کہ میں میکے جاؤں گی تو میں فوراً آٹو لے کر آجاتا ہوں اور انہیں پہلی فرصت میں میکے پہنچا دیتا ہوں۔ اس میں ذرا میں لیٹ نہیں کرتا، مگر جب وہ فون کرتی ہیں کہ آپ آجایئے، میں گھر چلوں گی تو ایک دو دن لیٹ کر دیتا ہوں۔ وہ غصہ میں کہتی ہیں کہ میکے بھیجنے میں ایک پل بھی لیٹ نہیں کرتے اور گھر بلانے میں دو دو دن لیٹ۔ میں کہتا ہوں کہ مردوں کی زندگی میں یہ فرصت کے لمحات مشکل سے ہاتھ لگتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں ان کے سر کے بال اب تک بالکل سیاہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تم بوڑھا ہونے میں کافی لیٹ کر رہے ہو، دیکھو میرے بال داڑھی سب سفید ہو چکے ہیں۔ جتنے میرے سر میں کالے بال ہیں اتنے تمہارے سر کے بال سفید نہیں ہوئے۔ یار! بوڑھا ہونے میں لیٹ مت کرو، ورنہ جب قبر میں اُتارے جاؤ گے، لوگ دیکھیں گے تو افسوس کریں گے کہ مرنے والا جوانی میں ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا اور لوگوں کی آنکھوں سے دو چار قطرے زیادہ ہی آنسو نکل جائیں گے۔

آج اس جدید دور میں لڑکے جوان ہونے میں لیٹ نہیں کر رہے ہیں بلکہ بوڑھے، بوڑھے ہونے میں لیٹ کر رہے ہیں۔ ہاں! نوجوان بھی لیٹ کر رہے ہیں رات کو سونے میں لیٹ اور صبح کو اٹھنے میں لیٹ، یعنی لیٹ ان کے رگ و پے میں خون کی طرح سرایت کر گیا ہے۔

ہاں! آج کے نوجوان ایک کام کرنے میں ذرا لیٹ نہیں کرتے، وہ ہے پیار و محبت، ابھی لب پر سیاہی بھی نہیں آئی ہے، مگر عشق لڑانے میں اتنے ماہر ہو گئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر بوڑھے بھی شرمائیں۔ اسی پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ شادی کے بندھن میں بھی لک چھپ کر بندھ جاتے ہیں، اس میں ذرا بھی لیٹ نہیں کرتے۔

میں کسی بھی پروگرام میں جاتا ہوں تو وقت پر حاضر ہو جاتا ہوں۔ بیگم کہتی ہیں آپ اتنی جلدی کیوں کسی پارٹی میں چلے جاتے ہیں۔ تھوڑا لیٹ سے جایئے گا تو میزبان کو انتظار رہے گا، اس سے مہمان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اب ایسا ہی کروں گا۔

اتفاق سے ایک پارٹی میں جانے کی دعوت ملی۔ پارٹی کا وقت دوپہر کا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ دو بجے تک تو لوگ پہنچ ہی جائیں گے، میں تین بجے جاؤں گا۔ بھلے ہی مجھے بوٹی ملے یا نہ ملے۔ روکھی سوکھی بریانی پر ہی اکتفا کر لوں گا۔ تین بجے خراماں خراماں میزبان کے گھر کی

طرف نکل گیا۔ وہاں ساڑھے تین بجے پہنچا، دیکھا تو ساری کرسیاں خالی پڑی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اب تو روکھی سوکھی بریانی بھی ملنے کی صورت نظر نہیں آتی۔ یہی سوچ رہا تھا کہ میزبان کی آمد ہوئی۔ ان سے علیک سلیک ہوا۔ اس کے آگے میں کچھ بولوں، ہمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہی کہا، بیٹھئے اب لوگ آتے ہی ہوں گے۔ میں نے کہا۔ مہمان ابھی تک آئے نہیں؟ انہوں نے کہا۔ آپ ہی سب سے پہلے تشریف لا رہے ہیں، عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ ہماری زندگی میں، ہمارے سماج میں ''لیٹ'' نے کس قدر اپنا پاؤں پھیلا رکھا ہے۔

مشاعروں میں شاعر و شاعرات بھی کم ''لیٹ'' سے نہیں آتے۔ ایک مشاعرے میں شاعرہ اسٹیج پر لیٹ سے پہنچیں۔ سامعین شور مچانے لگے۔ شاعرہ کہنے لگیں۔ میں لیٹ آنے کی وجہ آپ لوگوں کو بتاتی ہوں۔ سامعین ایک دم شانت ہوگئے۔ شاعرہ نے کہا ع

میں لیٹ آئی، لیٹی تھی، مجھ پر کوئی لیٹا تھا

اتنا کہنا تھا کہ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا، جب تالیوں کی آواز کم ہوئی تو شاعرہ نے کہا، اب مکمل شعر سماعت کریں۔

میں لیٹ آئی لیٹی تھی، مجھ پر کوئی لیٹا تھا
میں اس کو سمجھا نہ سکی کیوں کہ وہ میرا بیٹا تھا

پورے ہال کا منظر ہی بدل گیا۔ سامعین پھر خاموشی سے مشاعرے کا لطف لینے لگے۔ لیٹ آنے کا شکوہ دور ہوگیا۔

ہم کہاں کہاں ''لیٹ'' ہیں اس کا شمار آپ خود کریں۔ اس لیے کہ دسوں انگلیاں آپ کے پاس ہیں تو پھر دیر کس بات کی۔ انگوٹھے کو انگلیوں سے ملائیے اور شمار کرتے جائیے، جب شمار کرلیں گے تو اس کے اعداد و شمار سے مجھے بھی مطلع فرمائیں گے۔ اعداد و شمار بتانے میں سب کچھ کریں گے، مگر ''لیٹ'' مت کیجئے گا۔ ❁❁

بوجھ (ص ۴۴ سے آگے)

اس نے مجھے اطمینان بخش جواب نہیں دیا صرف ''ابھی آتی ہوں......'' کہا اور چلی گئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا، وہ نہیں آئی...... دوسرا گھنٹہ بیت گیا، پھر سورج سر پر آ کر ڈھلنے لگا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں حواس باختہ اسے تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ وہ آ گئی۔

اس کا چہرہ رنجیدہ تھا۔ غم میں ڈوبا ہوا۔ آنکھوں میں شوخی تھی نہ چمک۔ لبوں پر چھائی اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سنبھالے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لب لرز رہے تھے، لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی، میرے لب بھی کپکپا رہے تھے، لیکن مجھ میں اسے مخاطب کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ چند لمحے نہایت پر اذیت گزرے، پھر وہ بے اختیار دوڑتے ہوئے میرے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ میں اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو سنبھالے اس کا سر تھپتھپانے لگا:

''کیا ہوا بیٹی......کیا ہوگیا؟''

میری آواز میں خوف زدہ لرزش تھی۔ وہ جواب میں ہچکیاں لینے لگی۔

''بتا نا بیٹی......کیا ہوا......بتا!''

میں اس کی پیٹھ تھپتھپا کر رونے لگا۔ وہ ہچکیاں لے کر بولی:

''ابو! اس کا ٹرانسفر ہوگیا۔ وہ چلا گیا مجھ سے شادی کا وعدہ کر کے اس نے مجھے برباد کر دیا۔ اس کے آفس والوں نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔'' بیٹی میرے سینے پر سر رگڑ کر رو رہی تھی۔ میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ میرا خواب، ایک بیٹی والے مفلس باپ کا خواب، ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔

جب خواب ٹوٹتے ہیں، جب امید یقین و اعتماد کی دہلیز پر آ کر دم توڑ دیتی ہے، تب جذباتی طوفان بے قابو کر دیتا ہے۔ میں نے اس ناقابل برداشت طوفان پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی اور بولا:

''بیٹی تیری پرخلوص محبت کا اس پرفریب دنیا میں کوئی قدر کرنے والا نہیں، مت رو میری بیٹی، میرے جگر کے ٹکڑے مت رو...... میں بھی برباد ہوگیا۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا پھر سر جھکا کر ایک بہت گہری موت کی سی سرد آہ بھری۔ اس کے بعد پھر مجھے پنشن کا انتظار رہا، نہ اسے شادی کی ضرورت۔ ❁❁

منظومات

معین کوثر
Alamganj, Patna - 800007 (Mob. 9334994565)

مناجات

چھن گیا تھا جو سہارا اے خدا
میں نے تجھ کو ہی پکارا اے خدا

تو جو بن جائے ہمارا اے خدا
وقت کا پھر جائے دھارا اے خدا

پار لگ جائیں ترے بندے سبھی
تو اگر کردے اشارا اے خدا

تیری قدرت سے کسے انکار ہے
تیرے آگے کس کا یارا اے خدا

تو اگر راضی رہے تو جھیل لوں
درد و غم سارے کا سارا اے خدا

مانگنے سے بھی سوا تو نے دیا
ہم نے دامن جب پسارا اے خدا

تیری کن کن نعمتوں کا ذکر ہو
من و سلویٰ بھی اُتارا اے خدا

زلف ہستی جب پریشاں ہوگئی
تو نے ہی اس کو سنوارا اے خدا

جو بھی گھر تاریک ہے ، سنسان ہے
بخش اُس میں چاند تارا اے خدا

اپنے کوثر کو کرا دے ایک بار
سبز گنبد کا نظارا اے خدا

❁❁❁

حافظ تمنا پھلواروی
Tamanna Lodge, Sangi Masjid Road, Phulwari Sharif, Patna - 801505 (Mob. 9931606459)

نعت پاک

کوئی بتلائے کیا شانِ محمدؐ
خدا خود ہے ثنا خوانِ محمدؐ

خدا کی معرفت حاصل ہو جس کو
اُسے ہوتا ہے عرفانِ محمدؐ

خدا کرتا ہے خود حاجت روائی
جو بن جاتا ہے مہمانِ محمدؐ

کمالِ کبریائی ہوگا ظاہر
کبھی کر یاد احسانِ محمدؐ

خدا خوش ہوگا تیرے ہر عمل سے
نظر میں رکھ تو فرمانِ محمدؐ

خدا دے نعت حافظ کو وہ رتبہ
پڑھیں سب کلمہ گویانِ محمدؐ

❁❁❁

غزلیں

وارثؔ ریاضی

"Kashana-e-Adab" Sikta Deoraj, P.o. Baswaria,
Via. Lauriya, W.Champaran 845453(Mob. 8228902548

شب امواجِ طوفاں میں کبھی ٹکرا کے ساحل سے
سرِ منزل پہنچ کر بھی پلٹ جاتا ہوں منزل سے

خدائے پاک نے بخشا مجھے ، وہ عزمِ مستحکم
بہ آسانی گزر جاتا ہوں میں مشکل مراحل سے

مخالف سے بھی اخلاص و وفا سے پیش آتا ہوں
خدا شاہد ہے ، اس کی قدر کرتا ہوں تہہ دل سے

بنا دے گا وہ خود اپنی طرح ناکام دنیا میں
خدا محفوظ رکھے ہر بشر کو مردِ کاہل سے

وہ آیا ہے سلیقہ زندگی کا مجھ کو سکھلانے
کہ جو واقف نہیں ہے آج تک آدابِ محفل سے

سبھی عیش ومسرت میں مگن ہیں ، میں ہوں رنجیدہ
جو کچھ مجھ پر گزرتی ہے ، کوئی پوچھے مرے دل سے

یہ کیسا سوگ کا ماحول ہے صحنِ گلستاں میں؟
کہ دل کی دھڑکنیں ہیں تیزتر ، شورِ عنادل سے

اچانک اشک برسانے لگیں آنکھیں مری وارثؔ
نہ جانے کون اُٹھ کر چل دیا ہے ، میری محفل سے

❀❀❀

ظفر اقبال ظفرؔ

170- Kheldar, Fatehpur - 212601
(Mob. 8756433896)

لہو کی روشنی ظلمات کے محور میں رکھ آئیں
چلو یہ بھی کریں سر دشمن خنجر میں رکھ آئیں

ستاروں کی طرح یہ بھی نظر کو روشنی دیں گے
ہم اپنے اشک بھی اُس نیلگوں پیکر میں رکھ آئیں

ضرورت ہے ہمارے شہر والوں کو اُجالے کی
چلو یہ آگ کے شعلے ہم اپنے گھر میں رکھ آئیں

ہماری آنکھ زخمی ہو کے بینائی نہ کھو بیٹھے
سوادِ شام کے منظر پس منظر میں رکھ آئیں

مسلسل بڑھتا جاتا ہے مسائل کا سفرنامہ
ہم اپنی اُلجھنیں اب شیشہ و ساغر میں رکھ آئیں

ہمارے دل کی بربادی کا رشتہ ہے اُسی سے اب
کہ برگِ خشک کو شاخِ ثمر آور میں رکھ آئیں

ظفرؔ دیکھا نہیں جاتا ہے ہم سے کھیل شعلوں کا
اب اپنی آگ بھی جلتے ہوئے منظر میں رکھ آئیں

❀❀❀

خالد عبادی

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna - 800004 (Mob. 9835480456)

غزلیں

مجھے تلاش ہے جس کی کہاں نہیں ملتا
جہاں ہے فرقِ من و تو وہاں نہیں ملتا

سنائیں حالِ دل بے قرار کس کو ہم
بہت تلاش کیا ، مہرباں نہیں ملتا

تمہارا تجربہ شاید ہو مختلف مجھ سے
جہاں کی خاک اُڑاؤ ، وہاں نہیں ملتا

اسی لئے تو سمجھتے ہیں مبتلا خود کو
تری گلی میں بھی ہم کو اماں نہیں ملتا

تجلیات کے بارے میں جانتے کیا ہو
نشاطِ دہر میں رنج گراں نہیں ملتا

اگرچہ شعر سناتے ہو بے کرانی پر
مگر خیال کراں تا کراں نہیں ملتا

اگرچہ ملنا ملانا بھی خوب ہے لیکن
وہ بے غرض ہوں کسی سے میاں نہیں ملتا

❁❁❁

چلو زمیں نہ سہی آسمان تو ہوگا
کہیں خلا میں ہمارا مکان تو ہوگا

گزر رہا تھا اِدھر سے تو یہ خیال آیا
زہے نصیب تجھے میرا دھیان تو ہوگا

کہ جیسے ننھے دیوں میں کہیں چھپا ہے تو
قدم قدم پہ ترا امتحان تو ہوگا

جسے تلاش کیا اور پا لیا میں نے
مرا رفیق نہیں میری جان تو ہوگا

گزارشات پہ تم کان کیوں نہیں دھرتے
رقیب خوش جو نہیں بدگمان تو ہوگا

خیال آتے ہی وحشت میں چل پڑے گھر کو
لگا ہماری بھی آہٹ پہ کان تو ہوگا

اسی کی روشنی میں فیصلہ کریں احباب
ہمارے حق میں عدو کا بیان تو ہوگا

❁❁❁

غزلیں

توقیر عالم توقیرؔ
Deptt. of Urdu, Maulana Mazharul Haq
Arbic & Persian University, Patna - 800001

کس کا اسیر دل ہے ترے بعد آج بھی
اک رنج مستقل ہے ترے بعد آج بھی

خوشبو نہ گلستاں میں ہے، رنگت نہ گل میں ہے
کہنے کو آب و گل ہے ترے بعد آج بھی

اک شاخ جھک رہی تھی وہ چھت پر جو اس طرف
آنگن سے متصل ہے ترے بعد آج بھی

جس در کو تیرے پاؤں نے بوسے کبھی دیئے
چوکھٹ وہ مضمحل ہے ترے بعد آج بھی

بھنورا جو کر رہا تھا ترے حسن کا طواف
یادوں میں وہ مخل ہے ترے بعد آج بھی

غم کی سیاہ رات کٹی ہی نہیں کبھی
مہتاب منفعل ہے ترے بعد آج بھی

❁❁❁

محمد ضمیر رضاؔ
Deptt. of Urdu, Patna University, Patna - 800005

جب کبھی بات چلی رندوں میں پیمانے کی
ساقیا بڑھ گئی شہرت ترے میخانے کی

آنکھ بھر آئے دعا میں تو سمجھنا اس کو
آرزو پوری ہوئی دل کے گھر پانے کی

تشنگی پھر مجھے صحرا کی طرف لے کے چلی
ہے فقط پیاس مری پیاس کے بڑھ جانے کی

مجھ کو اک روز ذرا پڑھنے کی کوشش تو کرو
یہ عبارت ہے مرے درد کے افسانے کی

منزل شب میں پکارے گا ہمیں کون رضاؔ
یہ گھڑی آئی ہے ظلمت میں اُتر جانے کی

❁❁❁

شش ابیات

جو یہی رہیں گے تیور تو چھپے گی کیا محبت
کبھی ہم خفا خفا سے، کبھی تم خفا خفا سے (جمیلؔ مظہری)

میں وہ صحرا جسے پانی کی ہوس لے ڈوبی
تو وہ بادل جو کبھی ٹوٹ کے برسا ہی نہیں (سلطان اخترؔ)

تخم ریزی کر رہا ہوں میں اِسی امید پر
پھولتے پھلتے ہوئے کل یہ شجر دیکھیں گے لوگ (رمزؔ عظیم آبادی)

نہ ہو سکا کبھی مجھ سے ضمیر کا سودا
مری تلاش نہ کر تو کلاہ والوں میں (لطف الرحمٰنؔ)

کتنا عظیم شخص ہے ہر غم کے باوجود
یوں ہنس رہا ہے جیسے کبھی کچھ ہوا نہ تھا (شمیمؔ فاروقی)

اے جذبۂ خودداری جھکنے نہ دیا تونے
لکھنے کے لئے ورنہ سونے کے قلم آتے (کیفؔ عظیم آبادی)

ڈاکٹر شمع ناسمین نازاںؔ

Shama Academy, Rahmat Colony, Phulwarisharif, Patna- 801505

غزلیں

شجر شاداب جسمانی ثمر مہتاب روحانی
سفر کا شوق غالب عقل کو ہے دل کی دربانی
غمِ دوراں ، غمِ جاناں ، غمِ دل نے سکوں چھینا
مسافر زندگی اپنی مسلسل عکس حیرانی
زمیں اوجھل ، فضا دھندلک ، نگہ حیراں ، بدن لرزاں
عجب خوابوں کی طغیانی ہزاروں میل تک پانی
جو آئے زندگی میں تم مری تو انقلاب آیا
سہانی زندگانی اور شکستہ دشمن جانی
زمیں پر ہوں زمیں پر ہی مجھے رہنے دو شاداں ہوں
ہے حرص آسمانی میں نہاں عالم کی ویرانی
مسلماں ہیں مگر طاقوں میں قرآں رکھ دیا ہم نے
حیاتِ مصطفیٰ تھی عامل تفسیر قرآنی
سحر سے شام تک ہے کشمکش کا مرحلہ نازاںؔ
نظر وحشت ، سکوں عنقا ، پشیماں خطۂ جانی

❁❁❁

مجھ پہ نگاہ اس نے کی کیا التفات کی
دنیا سمٹ کے رہ گئی ہے خواہشات کی
مانا لبوں پہ مہر تھے ، خاموش تھی زباں
لیکن ادائے ناز نے آنکھوں سے بات کی
پل میں بکھر کے رہ گئی برسوں کی دوستی
تحریک ایسی چل پڑی مذہب کی ذات کی
اس کو ہی دیکھا میں نے گواہی میں پیش پیش
جس کو نہیں ہے کوئی خبر واردات کی
تعریف بھی زبان سے کس کس کی میں کروں
ہر چیز بے مثال ہے اس کائنات کی
دینی نہ ، دنیوی ، نہ محبت ، نہ عشق کی
لوگوں نے ہر مقام پہ پیسوں کی بات کی
نازاںؔ شب وصال کہوں کس طرح اسے
ہجراں نصیب ہے جو یہ ساعت ثبات کی

❁❁❁

اشعارِ راسخؔ

خموشی کے پردے میں ہے شور میرا
عشق اک لذت روحانی ہے
عشق ہے حسن طلب ، حسن ہے مشتاق نظر
بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا

مجھے چپ نہ جانو ، سراپا فغاں ہوں
عشق کیفیت وجدانی ہے
ہم کو درکار ہو اب تم ، تمہیں درکار ہیں ہم
لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنس وفا ہم

سلیم سرفراز

Musaddi Muhallah, Asansol - 713325 (West Bengal) (Mob. 9378291891)

غزلیں

وصل اور ہجر کا جنجال مرے یار ہٹا
عمر بھر دیتے رہے دل کو جو آزار ، ہٹا

کشتگانِ تپش مہر پہ ہنسنے والے
تو بھی تو سر سے ذرا سایۂ اشجار ہٹا

دشت ہی دشت نظر آئے گا اس کمرے میں
چارجانب جو کھڑے ہیں در و دیوار ہٹا

جنگ سے میں بھی گریزاں ہوں،مگر میرے حریف
صلح کرنی ہے تو پھر بیچ سے تلوار ہٹا

کوچۂ سنگ دلاں روز بلاتا ہے مگر
ٹوٹ جائے نہ وہاں شیشۂ پندار ، ہٹا

عین ممکن تھا کہ وہ مجھ پہ بھی وا ہوجاتا
کل میں دروازۂ امید سے بیکار ہٹا

شدت گریہ سے سرسبز مجھے ہونا ہے
میرے اطراف سے یہ مجمع غم خوار ہٹا

عافیت دینے لگا سایۂ دیوار سلیم
کون ہو دھوپ سے اب برسر پیکار ، ہٹا

❀❀❀

بلا کی دھوپ تھی اک سائباں اُٹھا لائے
ہم اس زمیں کے لیے آسماں اُٹھا لائے

ہمیں بس ایک شجر کی تلاش تھی لیکن
تم اپنے دوش پہ جنگل کہاں اُٹھا لائے

قفس ہی جیسے انہیں سازگار لگنے لگا
پرند سارے وہیں آشیاں اُٹھا لائے

میں تھک کے بیٹھ گیا گھر پہ تو سبھی رستے
مرے قرین سفر رفتگاں اُٹھا لائے

کوئی شجر ، نہ کہیں دور تک کوئی دریا
یہ کس جگہ پہ مرے مہرباں اُٹھا لائے

مزاجِ شہر سے ہوتا نہیں تھا ہم آہنگ
سو اس خرابے میں اپنا مکاں اُٹھا لائے

سفر میں اس کو ضرورت تھی کچھ اجالے کی
ہم اس کے راستے میں کہکشاں اُٹھا لائے

حصولِ نفع میں مصروف تھے جہاں سارے
ہم اس مقام سے کارِ زیاں اُٹھا لائے

سلیم مشغلۂ فکر و فن پہ سب نے کہا
کہاں سے یہ ہنر رائگاں اُٹھا لائے

❀❀❀

انور جاوید شاداںؔ

Shah Juma, Sasaram, Rohtas - 821115 (Mob. 8863007484)

غزلیں

دیکھنے منظر حسیں چلتے ہیں خضرا کی طرف
دل کی حسرت ہے کہ جاؤں میں بھی طیبہ کی طرف
کام جو کرنا ہے کر لو کیا بھروسہ زیست کا
کیوں نظر رکھتے ہو یارو آج فردا کی طرف
دعوتِ جشن بہاراں اب نہ مجھ کو دیجئے
''دل کھنچا جاتا ہے اپنا اب تو صحرا کی طرف''
ہر طرف سیلابِ نفرت کی ہے یورش ان دنوں
کس لئے پھر اہل دل جاتے ہیں صحرا کی طرف
پھر نئی سازش رچی ہے حلقۂ الحاد نے
اب دھواں اُٹھنے لگا ہے پھر کلیسا کی طرف
جل رہی ہیں حسن کے شعلوں سے اب آنکھیں مری
ہے نظر قاصر جو دیکھے روئے زیبا کی طرف
ہر طرف قدرت کے ہیں دل کش نظارے اس لئے
دیکھتا رہتا ہوں شاداںؔ دشت و صحرا کی طرف

❁❁❁

مرے اظہار الفت سے وہ پتھر ٹوٹ جاتا ہے
بدل جاتے ہیں ذہن و دل ، ستمگر ٹوٹ جاتا ہے
زمانے بھر کے طوفاں سے جو ٹکراتا رہا ہر دم
بھنور کی زد میں آتے ہی وہ اکثر ٹوٹ جاتا ہے
مری کشتی سمندر کی سطح سے جب گزرتی ہے
پہنچتی ہے کنارے پر تو لنگر ٹوٹ جاتا ہے
اسے کیا نام دوں میں درد کی کالی گھٹاؤں میں
کوئی تو ہے جو میرے دل کے اندر ٹوٹ جاتا ہے
بنا کر ریت پر کوئی گھروندا ، ناز مت کرنا
کہ جو بھی ریت پر بنتا ہے وہ گھر ٹوٹ جاتا ہے
اسے میں قید کرلوں کس طرح آنکھوں کے زنداں میں
سمندر کے تلاطم سے جو منظر ٹوٹ جاتا ہے
سمندر کی طرح شاداںؔ نہ کھونا حوصلہ کیوں کہ
مرے پانی سے ٹکرا کر سمندر ٹوٹ جاتا ہے

❁❁❁

مطالع
کلیم عاجزؔ

روشنی کی دھوم ہے لیکن اندھیرا عام ہے
صبح بھی ایسی نظر آتی ہے گویا شام ہے
غرض کسی سے نہ اے دوستو کبھو رکھیو
بس اپنے ہاتھ یہاں آبرو رکھیو
تلخیاں اس میں بہت کچھ ہیں، مزا کچھ بھی نہیں
زندگی دردِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
فن میں نہ معجزہ ، نہ کرامات چاہئے
دل کو لگے بس ایسی کوئی بات چاہئے

نام کتاب	:	پسِ غبارِ وجود
مصنف	:	منظر اعجاز
مرتب	:	ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۱۶۱ قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	عبدالرزاق رضوی

ڈاکٹر منظر اعجاز تحقیق وتنقید، شعروسخن اور درس وتدریس کی دنیا کا ایک معتبر نام ہے۔ جن کی زبان و بیان کی پختگی، شعور وآگہی کی صلابت، فہم و ادراک کی سرعت، فکروخیال کی ندرت اور لب ولہجہ کی متانت وسنجیدگی کا شہرہ ہم عصروں میں گونج رہا ہے۔ قلم سیال، فکر پاکیزہ اور انداز تحریر نہایت سنجیدہ وشگفتہ ہے۔ ان کے قلم کا بانکپن، خیال کی بلندی اور نقد وتحقیق کی نفاست دیکھنی ہو تو ان کے مضامین ومقالات کا مطالعہ کیجئے جو مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے، ہر لمحہ ایک نئی لذت و چاشنی کا احساس ہوگا۔

بلاشبہ ایک ناقد ومحقق کے حوالے سے ان کی ایک خاص شناخت نمایاں ہے۔ مضمون تنقیدی ہو یا تحقیقی، ادبی ہو یا اصلاحی اخلاص و دیانت اور گہرائی و گیرائی کے جلوے ان کی تحریروں میں ہر جگہ روشن نظر آتے ہیں۔ ابھی میرے پیش نظر ان کا مجموعہ کلام ''پسِ غبارِ وجود'' ہے، جس کو ان کے لائق شاگرد ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر نے ترتیب وتدوین کے زیور سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے۔ کتاب کا انتساب پروفیسر مظہر مہدی کے نام کیا گیا ہے۔ اندرون فلیپ کے دونوں جانب احمد کفیل کی تاثراتی تحریر نے شمولیت پائی ہے، جب کہ پشت کتاب پر منظر اعجاز کی خوبصورت تصویر دی گئی ہے۔ دیباچہ میں ظفر انصاری ظفؔر نے اپنے استاد کے اخلاص ومحبت اور ان کے فکروفن کے حوالے سے والہانہ گفتگو کی ہے جس سے ان کی ایک عظیم شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

''پسِ غبارِ وجود'' دو نعتوں، انتیس غزلوں، نو نظموں و دیگر متفرقات پر محتوی ہے، واضح ہو کہ منظر اعجاز کو افسانہ وناول سے بھی خاص شغف رہا ہے، جس کے متعدد بہ حصے مختلف رسالوں کے صفحات میں محفوظ ہیں اور تادمِ تحریر اشاعت کے منتظر۔ جہاں تک ڈاکٹر منظر اعجاز کی شاعری کا تعلق ہے، اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ورق ورق اُجالا'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا تھا جو بے حد مقبول عام ہوا۔ اس سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ غزلوں کی جانب ان کے فکروشعور کا غالب رجحان تھا۔

منظر اعجاز کی غزلوں پر بحث سے پہلے مناسب ہے کہ نوع غزل کے تعلق سے کچھ بنیادی وتاریخی باتیں پیش کر دی جائیں۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے، لیکن عربی ادب وانشا میں غزل کے نام سے الگ قسم کی کوئی صنف وجود میں نہیں آسکی۔ البتہ قصائد میں عربی شعرا جو تشبیب لکھتے رہے ہیں، اس میں غزلوں کا پرتو ضرور نظر آتا ہے۔ غزل کا اصل روپ فارسی شاعری میں نمودار ہوا اور رودؔکی، عرفؔی، عراقؔی، حافظؔ، سعدؔی، نظیرؔی وغیرہ کی غزلیں نشان منزل بن گئیں۔ فارسی زبان سے غزل اردو زبان میں اپنی ظاہری اور معنوی ہیئت کذائی کے ساتھ وارد ہوئی، لیکن اس سفر میں غزل کے معنی میں بھی بہت ساری تبدیلیاں در آئیں اور عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف، معرفت، عشق الٰہی، دنیا کی بے ثباتی، پند ونصیحت اور زندگی کے دوسرے مسائل بھی شامل ہو گئے۔ اس طرح غزل ایک بحر ذخار بن گئی، لیکن غزل کی ہیئت فارسی غزل کے پرانے نمونے پر ہی قائم رہی۔

اس کے علاوہ غزل کی باطنی اور معنوی ترکیب میں بھی کچھ چیزیں ضروری قرار دی گئیں، مثلاً سوز وگداز، جذبات کی والہیت،

سلاست وروانی،نغمگی وخوش نوائی،تخیل کی بلندی،تفکر کی صلابت،فنی کرب کی آمیزش، درون بینی،معنویت، ابتکار وتازہ کاری،تشبیہ،استعارے، اشاریت وعلامت نگاری،الفاظ کی ترکیب میں شگفتگی وخوش آہنگی،نفاست و اعتدال،ایجاز واختصار وغیرہ بھی لوازم غزل ٹھہرے اور گویا ان صفات نے غزل کو قوس قزح کی نیرنگی،آفاقیت اور لازوال ابدیت بخش دی۔

عہد اوّل اور عہد میانہ کے غزلیہ سرمایہ سے قطع نظر،عہد نوین کی متاعِ غزل پر نظر ڈالیں تو بلا تامل اور بلا توقف یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج کے دور میں چند در چند وجوہ سے غزل کا دامن اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ سابقہ ادوار میں شاید اس کا تصور بھی آسان نہ تھا۔

غزل ایک سخت جاں صنف ہے اور اس کی تاریخ گواہ ہے کہ کلاسیکی عہد سے لے کر عصر حاضر تک اس نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔راہوں میں کئی مقام پر اسے معتوب بھی ہونا پڑا پھر بھی اس کی زندہ دلی وتازگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔درمیان سفر اُسے مختلف تحریکوں سے بھی واسطہ پڑا،لیکن یہ کسی تحریک سے مغلوب ہونا تو دور کی بات رہی، مرعوب بھی نہ ہو سکی، بلکہ ہر زمانے میں ہنستی کھیلتی ہوئی عروج وارتقا کی منزل طے کرتی رہی۔آج اس کے دامن میں بے شمار اصحاب فن آسمان کے ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ان کے رنگا رنگ اسالیب کی کرنیں سمائے غزل پر افق تا افق پھیلی ہوئی ہیں۔

منظر اعجاز کا شمار بھی انہیں روشن ستاروں میں ہوتا ہے۔ انہیں غزل کے فنی تقاضوں کو نبھانا اور اس کی زلفوں کو سنوارنا بخوبی آتا ہے۔وہ خود ایک بڑے ناقد ہیں،اس لئے ان کے احساسات وجذبات کی گرمی اور افکار وخیالات کی بلندی نے ان کی شعری کائنات کو منفرد شناخت کا حامل بنا دیا ہے۔

منظر اعجاز کے کلام میں تین اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پہلی خصوصیت تازہ گوئی ہے، دوسری درون بینی ومعنویت اور تیسری سادگی وسلاست ہے اور یہ تینوں صفات غزل کی جان ہیں،خصوصاً اس دور میں جب کہ روایتوں سے گریز وقت کی ایک اہم خصوصیت بن گئی ہے۔تازہ گوئی سے عموماً اساتذہ نے جدت تخیل مراد لی ہے یعنی کسی خیال کو نیا جامہ پہنا دینا یا خیال کو کسی نئے طرز سے ادا کر دینا بشرطیکہ اس میں حسن تخیل بھی ہو اور حسن ادا بھی ہو۔

منظر اعجاز کے زیر نظر مجموعہ کا آغاز نعت نبی سے ہوتا ہے اور یقیناً ان کی دونوں نعت، ابتکار فن کی شان وشوکت رکھتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس میں فکر کا اخلاص بھی دیدنی ہے ؎

جب جلوہ گہ ناز کو بازار بنایا
خود بکنے چلا خود کو خریدار بنایا
اس عالم اسفل میں لگایا شجر نور
ہر شاخ کو پھر اس کی گہر بار بنایا
مقصود نمائش تھی اسے قدرت فن کی
تخلیق کے فن کا تجھے شہکار بنایا

دوسری نعت کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

متاع شوق ورائے جہانِ سود و زیاں
قبول بارگہ ناز ہوں یہ بندگیاں
طلوع نور مجسم سے ہوگئیں کافور
ہر ایک سمت جو پھیلی ہوئی تھیں تیرگیاں
وہیں ہے کوثر وتسنیم وسلسبیل کی رُت
نثار ان کی گلی کے ہزار زندگیاں

منظر اعجاز زندگی کے نشیب وفراز،عروج وپستی اور شادی وغم کو دانشمندی کے ساتھ غزل کے جمالیاتی رنگ وآہنگ میں ڈھالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔حسن وعشق،حسرت ویاس، گلے شکوے،ہجر وفراق، پند و نصائح،غزل کے عام موضوعات ہیں جن سے کسی شاعر کو مفر نہیں، انہوں نے بھی ان تمام موضوعات کو بڑے سلیقے سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔نرم وسنجیدہ انداز بیان، سادگی و پرکاری، رمز و کنایہ، خوبصورت تشبیہات واستعارات، ایجاز واختصار،صنائع وبدائع کی کہکشاں انہوں نے اپنی شاعری میں ژرف نگاہی کے ساتھ سجایا ہے۔اس طریقہ سخن کے باعث

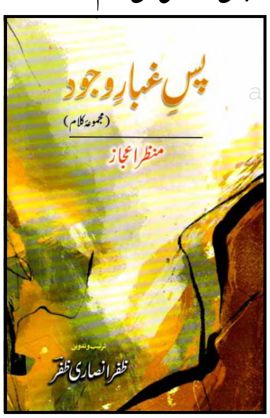

معانی و مفاہیم کے نئے، دروازے وا ہوگئے ہیں اور اشعار کی چاشنی زوداثر ہوگئی ہے۔انہوں نے زندگی کے تلخ وشیریں احوال کی پیش کش کے ساتھ عصری حسیت سے بھی سروکار رکھا ہے جس سے شاعری تنوع خیز دکھائی دیتی ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

پلٹ کر نہیں آنے والے گئے دن
تو بہتر یہی ہے کہ نہ وہ یاد آئیں
ہزاروں ہی غم دل میں گوشہ نشیں ہیں
کسے یاد رکھیں ، کسے بھول جائیں

نقش بر آب ہے مری ہستی
یعنی پانی کا بلبلہ ہوں میں
ایک نغمہ ہوں ساز ہستی کا
ایک بکھری ہوئی صدا ہوں میں

''پس غبارِ وجود'' میں تقریباً انیس منظومات شامل ہیں۔ایک نظم کو چھوڑ کر تمام نظمیں موضوع، مواد، فکر اور ہیئت کے اعتبار سے اچھوتی نہیں تو ناقابل اعتنا بھی نہیں ہیں۔ واقعات وخیالات کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے کسی بھی نظم میں ربط وتسلسل کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے۔

مزید یہ کہ متنوع موضوعات کی طرح اس کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔منظر اعجاز نے چہاروشش بیت میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ہر بیت تصنع، مبالغہ آرائی، ثقیل الفاظ، گنجلک تراکیب سے مبرا ہے اور شعروں میں آورد کے بجائے آمد کا رنگ نمایاں اور صاف ستھرے اور سلیس ورواں انداز سے زینت یافتہ ہے۔موضوعات کے اعتبار سے یہ تمام نظمیں حب قومی وحب وطنی، کچھ شخصی تو کچھ رثائی رنگوں پر مشتمل ہیں۔''اے میرے پیارے وطن''، ''ایک نظم قومی یکجہتی کے تناظر میں''، ''نئے سال کے موقع پر'' یہ تینوں نظمیں قومی وطنی جذبوں سے معمور ہیں، جب کہ ''میں نے جو خواب بنے''، ''اسی موڑ پر''، ''موت کی ایک رات''، ''خواب پس خواب''، ''چاند میں داغ نہیں'' رومانی قسم کی نظمیں ہیں۔ان میں سے ہر ایک نظم پاکیزہ جذبات واحساسات، روشن خیالات و افکار اور نیک تمناؤں کے اُجالوں سے منور ہے۔

ظفر انصاری ظفؔر کی خوش بختی ہے کہ انہوں نے اپنے محترم استاد منظر اعجاز کے ان غیر مطبوعہ کلاموں کی ترتیب وتدوین کا فریضہ انجام دے کر اسے منظر عام پر آنے کی سعی جمیل کی ہے، اس طرح انہوں نے ایک علمی وادبی خدمات انجام دے کر اپنے استاد مرحوم کی روح کو شادکام بھی کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ تازہ ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ شائقین ادب کے لئے بھی ایک علمی تحفہ ہے جو مطالعہ کا متقاضی ہے۔یقین ہے کہ منظر اعجاز کی علمی اور خصوصاً ان کی شاعرانہ شخصیت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ تصنیف لطیف معاون ومددگار ثابت ہوگی۔

نام کتاب	:	غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آبادوالوں سے
مصنف	:	فخر الدین عارفی
ناشر	:	دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ
اشاعت	:	۲۰۲۴ء
صفحات	:	۲۰۸ قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر طاہر الدین طاہؔر

''غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آبادوالوں سے''——یہ ہے اُس کتاب کا نام جو اِس وقت تبصرے کے لئے میرے مطالعہ کی میز پر ہے۔اس کتاب کے مصنف ہیں، جنابِ فخر الدین عارفی، جن کی پہلی کتاب ''سلگتے خیموں کا شہر'' آج سے پورے چالیس سال پہلے چھپی تھی، جو ان کے افسانوں کا مقبول ومعروف مجموعہ ہے۔اس کے بعد دوسرے افسانوی مجموعہ ''شہر احساس'' اور تنقیدی وتحقیقی مضامین کے زیر تبصرہ مجموعہ کی اشاعت کے لئے رواں سال، نیک فال ثابت ہورہا ہے۔

جناب عارفی ہمارے پرانے اور سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں۔ صحافت اور نظامت کے میدان میں بھی اُن کا نام ایک جانا پہچانا نام ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ عرصہ ادب سے مسلسل اور گہری وابستگی کے باوجود مصنف کہلانے کے معاملے میں نہ تو اُتاولا مزاج رکھتے ہیں اور نہ ہی نظر و نظریہ سے عاری تحریروں کی پیشکش پسند کرتے ہیں۔یہ ان سے میرے کسی ذاتی مراسم کا تاثر نہیں، بلکہ ان کی سابقہ اور زیر نظر تصنیف کے درمیان وقفہ اشاعت اور خصوصاً زیر نظر کتاب کے مطالعہ کا عمومی تاثر ہے۔

جناب عارفی نے اپنی اس کتاب کے اندرونی فلیپ پر عطا کاکوی کے جس بیان کو جگہ دیا ہے اور جس انداز تاثر کے ساتھ پروفیسر عبدالمغنی کے نام اپنی کتاب کا انتساب کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب اگرچہ تذکرے کی ردیف میں ہے، مگر خاص ادبی نظر و نظریے اور اس کی پیش کش کے موثر طور طریقے کے ساتھ قارئین کے سامنے لائی گئی ہے اور اسی رعایت سے اس میں کہیں طریق تکرار، کہیں وضع قطعیت اور کہیں قدرے طرز ادعائیت سے بھی کام لیا گیا ہے تا کہ زور بیان سے مقصدی اثر ونفوذ کے فوائد بیش از بیش مل سکیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے ''پیش لفظ'' کو مصنف نے ''دبستان کا تصور اور دبستان عظیم آباد'' کے ثانوی عنوان سے مزین کیا ہے اور یہاں صرف اہم بات یہ نہیں ہے کہ اس کی آخری سطروں میں مصنف نے عنقریب اس کتاب کی دوسری جلد پیش کرنے کا مژدہ سنایا ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے دلیلوں کے ساتھ، اپنے نقطہ نظر کی نہایت کامیابی سے توضیح کردی ہے اور لکھا ہے کہ:

''محققین عام طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ دکن، دہلی اور لکھنؤ جیسے اہم ادبی مراکز کی گراں قدر اور بیش بہا خدمات کے نتیجہ میں اردو کا ملک گیر سطح پر کوئی دبستان وجود میں آتا ہے جو اپنے انفرادی مزاج ومعیار سے تشکیل پاتا ہے، لہٰذا کسی چوتھے دبستان کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، لیکن میں اس مفروضہ کو تسلیم نہیں کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ ہی کوئی ادبی منطق، لہٰذا میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دبستانِ عظیم آباد بہر صورت اردو کا چوتھا اور ایک مستقل دبستان ہے...... چھوٹے چھوٹے تہذیبی مراکز کو (ہم) دبستان فکروفن کا درجہ دے سکتے ہیں کہ نہیں، یہ الگ سوال ہے، لیکن ان کی اہمیت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مراکز دبستان نہ سہی، لیکن تہذیب وتمدن کا ایک سرچشمہ ضرور ہوتے ہیں......اکبرآباد، مرشدآباد، جون پور، رام پور، بھوپال، بدایون وغیرہ......ان تمام مراکز کو دبستان تسلیم کیا جائے یا نہیں، یہ ایک مشکل اور دشوار سوال ہے، تاہم عظیم آباد اردو کا چوتھا دبستان ہے، اس میں اختلاف اور بحث کی شاید کوئی گنجائش نہیں ہے......موجودہ عہد میں کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دبستانوں کی اہمیت اور قدر و قیمت بہت کم ہوگئی ہے یا اب ان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، لیکن میں ایسے تمام خیالات وافکار کی نفی کرتا ہوں۔'' (غزال......ص۶،ص۸وص۹)

''پیش لفظ'' کی باتیں دعوائے بے دلیل نہ ہوں اور انہیں محض شخصی خیال یا خانہ زاد نظریہ نہ سمجھ لیا جائے، اس مقصد سے ٹائٹل مضمون ''غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے'' میں جناب عارفی نے جہاں اہم تاریخی واقعات سپرد قلم کیا ہے اور مشاعرے کی تاریخ بیان کی ہے، وہیں لکھنؤ والوں کی خودستائی کا رویہ بھی آئینہ کردیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ شاد دبستانِ عظیم آباد میں غزل گوئی کے بانی نہیں ہیں کیوں کہ دبستانِ عظیم آباد ''اتنا متاخر اور جدید نہیں'' یہ تو ''اردو کا قدیم ترین دبستان ہے جو دکن کا ہم عصر تو ہوسکتا ہے، لیکن لکھنؤ اس کے سامنے بہت نیا ہے۔'' (غزال......ص۱۰) اور پھر اپنی بات کو مزید تقویت دینے کے لئے انہوں نے عطا کاکوی کا وہ بیان بھی پورے حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

''میرا خیال ہے کہ دلی کے بعد اردو کی مرکزی حیثیت لکھنؤ کو نہیں بلکہ عظیم آباد کو حاصل ہے۔'' (غزال......ص۱۱)

عطا کاکوی نے یہ بات ۱۹۹۴ء میں کہی تھی اور گویا پوری تین دہائی کے بعد جناب عارفی کی اس کتاب کے توسط سے اس کا باقاعدہ ایک پورا منظر نامہ سامنے آیا ہے۔ اس کاوش کو کسی کا دل چاہے تو ادبی صوبائی عصبیت کا نام دے دے، لیکن فی الواقعہ یہ ادبی صوبائی تعصب نہیں بلکہ ادبی وصوبائی تصلّب ہے اور یقیناً اس پہلو سے اپنے اس مقصد میں یہ کتاب پوری طرح کامیاب ہے۔ دبستانِ عظیم آباد کی عظمت وقدامت کے نظریہ کو، مزید استحکام بخشنے اور اسے تسلیم کئے جانے کی ذہنی وفکری اور تاریخی وادبی راہ مزید ہموار اور آسان بنانے کی خاطر راسخ سے لے کر کیف تک اور پھر ''حصہ نثر'' میں قاضی عبدالودود سے شکیلہ اختر تک

مضامین اور فیچرز کا سلسلہ بڑھتا رہا ہے اور ''صحافت'' کے تحت حافظ سید محمد عمر فرید و سید عبدالرافع کی حیات و خدمات پر تنقیدی و تحقیقی نوعیت کے مضامین شامل کئے گئے ہیں اور ''دبستانِ عظیم آباد کے تعلق سے تین اہم کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ'' ہی نہیں ''اوراقِ پارینہ'' کے تحت ۱۹۰۲ء کے یادگار مشاعرے کا ذکر بھی ہے۔

جناب عارفی کی زیر نظر کتاب میں ''پیش لفظ'' اور ٹائٹل مضمون کے بعد ''مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی'' سے ''کیفؔ عظیم آبادی'' تک جو تحریریں شامل ہوئی ہیں وہ چودہ مضامین اور ایک فیچر پر مشتمل ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا یہی حصہ بہت خاص ہے جو ''پیش لفظ'' اور کتاب کے ٹائٹل مقالہ کے ادعائی بیان کو سنجیدہ معروضی بیان سے معتدل و محکم بنا دیتا ہے۔

اس حصے کے افتتاحی مضمون ''مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی'' میں جناب عارفی نے جہاں بیدلؔ اور غالبؔ و اقبالؔ کے متحد المضامین اشعار اور بیدلؔ کی تصانیف کا ذکر لایا ہے اور مجنوںؔ گورکھ پوری، عطاؔ کاکوی، قاضی عبدالودود، اختر اورینوی، صفیر بلگرامی کے بیانات اور ''ندیم'' بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے حوالے کے ساتھ اپنے اس مضمون کو تحقیقی و تجزیاتی رونق و رمق سے آشنا بنایا ہے، وہیں صاف لفظوں میں اس مطالعاتی نتیجہ کا اظہار بھی کر دیا ہے کہ:

''فارسی ادب میں بیدلؔ کا مقام بہت بلند ہے اور آج بھی اہل ایران بیدلؔ کے جلائے ہوئے چراغ سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔'' (غزال......ص۱۸)

یہاں بیدلؔ کے بعد ''راسخؔ عظیم آبادی'' کا ذکر آیا ہے اور اپنے تحقیقی نوعیت کے اس مضمون میں جناب عارفی نے تذکروں کے مطالعہ کی روشنی میں اور مزید برآں قاضی عبدالودود کے مضمون اور ساہتیہ اردو اکادمی کے مونوگراف وغیرہ سے غذا لیتے ہوئے جہاں راسخؔ کی سوانح پیش کی ہے وہیں ان کی شاعری کے تعلق سے واضح انداز میں لکھا ہے کہ:

''راسخؔ کی پوری شاعری میں ان کے دل کا عمل دخل غالب محسوس ہوتا ہے اور ان کی شاعری، خاص طور پر ان کی غزلیہ شاعری میں عشق کی کرشمہ سازی ہر جگہ صاف نظر آتی ہے......راسخؔ نہ صرف یہ کہ دبستان عظیم آباد کے بڑے شاعر ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اردو زبان کے بڑے شاعر ہیں اور ان کا شعری سرمایہ اردو کے لئے ایک قیمتی اثاثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(غزال......ص۳۵ و ص۳۶)

یہ تنقیدی خیالات اور اس مضمون کی تحقیقی محنتیں اپنی جگہ، لیکن اس مضمون میں راسخؔ کے شاگرد انور علی یاسؔ کا جو قطعہ نقل ہوا ہے وہ تسامحات کی زد میں آ گیا ہے، مزید یہ کہ اس قطعہ تاریخ وفات میں ''ہے ہے اوستاذم'' سے جو سن رحلت ۱۲۳۸ نکالا گیا ہے وہ غلط ہے، اس لئے کہ اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۰۸ برآمد ہوتا ہے۔

بیدلؔ و راسخؔ کے بعد شادؔ عظیم آبادی'' پر لکھے گئے اپنے قدرے طویل مضمون میں جناب عارفی نے شادؔ کی سوانح، ان کی تصانیف، شعری و نثری خدمات اور زبان و اسلوب پر نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شادؔ کی تخلیقی کائنات میں ہمیں نئی تہذیب کا نیا اجالا صاف نظر آتا ہے، ساتھ ہی پرانی تہذیب کے ختم ہونے اور مٹنے کا ماتم بھی جا بجا ان کی شاعری میں ایک اہم موضوع بن کر اُبھرتا ہے......شادؔ نے یقیناً عالمی سطح پر عظیم آباد کا پرچم بلند کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے...... لیکن (اس کے باوجود) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شادؔ کی سب سے زیادہ مخالفت اسی عظیم آباد میں ہوئی۔''

(غزال......ص۳۸ تا ص۴۰)

ذکر شادؔ کے بعد ''مولانا فضل حق آزادؔ عظیم آبادی'' پر لکھے گئے مضمون میں بہار اردو اکادمی کے مونوگراف، اختر اورینوی کی تحریر کے اقتباس اور ۱۹۶۱ء میں ''بزم اردو'' بی این کالج کی جانب سے شائع شدہ کسی کمیاب بلکہ نایاب کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت آزادؔ کی سوانح

بخوبی مرتب کی گئی ہے اور جناب عارؔفی نے یہ بھی درست لکھا ہے کہ:

''بہار اسکول کی تعمیر وتشکیل میں مولانا فضل حق آزاد کی خدمات بہت نمایاں اور قابل قدر ہیں۔'' (غزال......ص۵۱)

ادبی تاریخ لکھنؤ کے تناظر میں ''یگانؔہ چنگیزی'' کے احوال و مزاج ''معیار پارٹی'' کے تذکرے اور یگانؔہ کی آخری غزل کی شمولیت کے ساتھ جناب عارفی نے اُن کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''یگانؔہ چنگیزی دبستان عظیم آباد کا وہ واحد شاعر ہے جس نے اس بنیاد پر اپنے آپ پر فخر کیا کہ اس کا تعلق دبستان عظیم آباد سے ہے۔'' (غزال......ص۵۴)

اس حصہ میں ادبی وتاریخی نوعیت کی تمہید کے ساتھ ''سید شاہ حامد حسین حامؔد عظیم آبادی'' پر اپنے مضمون میں جہاں جناب عارفی نے خانقاہِ شاہ ارزانی اور درگاہ شاہ ارزاں کے مشاعرے کا ذکر کیا ہے اور حامؔد عظیم آبادی کے نمونۂ کلام سے نوازا ہے، وہیں فکر آروی کے اشعار پر اختتام پانے والی اس تحریر میں یہ ٹھوس بات بھی لکھ دی ہے کہ:

''بادشاہ نواب رضوی کے بعد عظیم آباد میں جب ہم کسی دوسری عظیم اور ادب نواز شخصیت کی تلاش وجستجو کرتے ہیں تو ہماری نظر سید شاہ حامد حسین حامؔد عظیم آبادی پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔'' (غزال......ص۶۲)

تمہید میں دبستان عظیم آبادی کی فضیلت کے بیان اور نہایت خوبصورت استعاراتی زبان کے استعمال کے ساتھ ''جمیؔل مظہری: ایک دانشور شاعر'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے جناب عارفی نے نہ صرف یہ کہ اُن کے اشعار کا برجستہ انتخاب پیش کیا ہے بلکہ جمیؔل مظہری کے افسانہ وناولٹ کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کتابوں کی طرف اشارہ بھی جو جمیؔل مظہری پر لکھی گئی ہیں۔ یہاں عارفی صاحب نے صرف یہ لکھنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ:

''جمیؔل مظہری بیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک بڑے فلسفی اور دانشور شاعر تھے۔'' (غزال......ص۷۲)

بلکہ ''دانشوری'' کی تفہیم کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کی تحریر کا اقتباس شامل کر کے اپنے عنوان کو اثباتی رنگ اور وزن و وقار سے آشنا بنانے میں بھی کامیابی پائی ہے۔

اس حصہ میں ''علامہ سید شاہ فضل امام واقؔف عظیم آبادی'' ایک تاثراتی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس میں اگرچہ ''واقؔف آرٹ'' علامہ کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری اور عصری تناظر میں ان کے یہاں بے پناہ تہداری اور دانشوری کا تفہیمی و یک گونہ تشریحی انداز کے ساتھ برملا اعتراف بھی ہوا ہے اور یہ بھی غلط نہیں لکھا گیا ہے کہ:

''دبستان عظیم آباد میں شعر وسخن کے مختلف رنگ وآہنگ ملتے ہیں، ان میں ایک رنگ علامہ سید شاہ فضل امام واقؔف کا بھی ہے...... انہوں نے سیاست اور ادب کا اپنے فن میں جو حسین امتزاج پیدا کیا ہے، اس کی دوسری نظیر کم ملتی ہے۔'' (غزال......ص۸۷وص۷۹)

لیکن اظہار مطالعہ کے دوران اس میں یک گونہ ادعائیت اور خودستائی کا جو عنصر شامل ہو گیا ہے، اس کی عدم شمولیت ہی اولیٰ وانسب تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر کے اقتباس اور کچھ سوانحی اشارے کے ساتھ ''مظہرامام'' پر لکھے گئے اپنے مضمون میں جناب عارفی نے اُن سے ملاقات اور ذاتی تعلقات کے تذکرے کئے ہیں اور ''حلقہ ادب بہار'' سے بھی ان کے تعلق کی بات لکھی ہے اور ایک خوشگوار انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ مظہر امام کے ''اَن گنت خطوط'' اُن کے پاس محفوظ ہیں۔ اس مضمون میں مظہر امام کی ادبی خدمات اور تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے جناب عارؔفی نے شاید یہ بھی غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''ان کے یہاں ہمیں نہ صرف روایت سے انحراف ملتا ہے بلکہ قدامت سے بغاوت بھی نظر آتی ہے۔''

(غزال......ص۸۳)

اسی طرح ''سلطان اخؔتر'' کو ان کی کتاب ''غزلستان کے آئینے میں'' دیکھتے اور دکھاتے ہوئے بھی جناب عارفی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے قول کا اقتباس لایا ہے اور نہ صرف عظیم آباد میں سلطان اخؔتر کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے بلکہ اصلاً ''غزلستان'' پر تبصراتی نوعیت کے اس مضمون میں ''غزلستان'' کے فن کاری کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ:

''جن پر غزل کی شاعری ناز کر سکتی ہے، ان میں ایک نمایاں نام سلطان اخؔتر کا ہے۔'' (غزال......ص۸۸)

بعدازیں ''رمز عظیم آبادی'' کے بارے میں جناب عارفی نے ان کے قصائد رمضان، قطعات و رباعیات اور تقدیسی وتہنیتی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ وہ ''بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے'' (غزال.....ص۹۵) وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ہم ان کی غزل کو ''اردو غزل کی آبرو کہہ سکتے ہیں'' (غزال ......ص ۹۷) اس مضمون میں اگرچہ رمز کے پہلے مجموعہ کلام ''نغمۂ سنگ'' کا ذکر نام کے ساتھ نہیں آسکا ہے، مگر اس میں دورائے نہیں کہ یہاں اظہار تاثرات اور تنقیدی تجزیہ کا حسین امتزاج ملتا ہے اور مضمون میں انداز پیش کش بہر حال بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے۔

اس حصہ میں مختصر سوانحی تذکرے کے ساتھ ''پروفیسر لطف الرحمٰن'' پر لکھا گیا مضمون اصلاً ان کی غزلیہ شاعری کے تنقیدی وتاثراتی تجزیہ پر مبنی ہے۔ اس میں جناب عارفی نے جہاں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ:

''ان کی غزلوں کا رشتہ جہاں ترقی پسند ادب سے کہیں نہ کہیں وابستہ نظر آتا ہے، وہیں جدید ادب کے وسیع تر احساسات بھی ہمیں ان کی غزلوں میں صاف اور واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں......(غزال ص۱۰۰)

وہیں یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ:

''وہ خاص طور پر غزل کے شاعر تھے، لیکن شاعری کی دوسری صنفوں میں بھی وہ اپنی مخصوص شناخت رکھتے تھے۔ اردو تنقید میں بھی وہ اپنا خاص نقطہ نظر رکھتے تھے اور اپنی احتسابی تنقید کے لئے مشہور تھے۔'' (غزال.....ص۱۰۵)

''شمیم فاروقی'' پر تعزیتی انداز سے اپنے مضمون کی ابتدا کرتے ہوئے جناب عارفی نے جہاں ان سے اپنے ذاتی مراسم کی یادیں تازہ کی ہیں اور ان کی سوانح کے ساتھ ان کے معاصرین کا بھی نام بہ نام ذکر لایا ہے، وہیں اردو کے جدید شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ دکھانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بات غلط نہیں لکھی ہے کہ:

''شمیم فاروقی کی غزلوں میں ہمیں پوری طرح غزل کی تہذیب، ڈکشن اور لطافت کا احساس ہوتا ہے......(اور ان) کی شعری کائنات میں ہمیں ہر جگہ ان کے دل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور کہیں بھی محض کمپوزنگ کا عمل دکھائی نہیں دیتا ہے۔'' (غزال.....ص۱۱۱)

ذکر شمیم کے بعد ''کیف عظیم آبادی'' اس حصہ کا اختتامی مضمون ہے جس کی تمہید میں دبستان عظیم آباد کو ''اردو کا چوتھا اور مستقل دبستان'' بتاتے ہوئے جناب عارفی نے اس کے متنوع خصائص پر نہایت عمدہ طریقہ سے اظہار خیال کیا ہے اور پھر کیف عظیم آبادی کی سوانح اور ان کی شعری خدمات کے تعلق سے ان کے ملکی وغیر ملکی اسفار، مشاعروں میں شرکت ومقبولیت اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کے برجستہ اشعار غزل پیش کئے ہیں بلکہ ان کی شاعری کا موضوعاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری اور سوانح کا رشتہ بھی سامنے لادیا ہے اور جہاں ایک طرف یہ لکھا ہے کہ:

''ان کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا ایک حسین امتزاج موجود ہے۔'' (غزال.....ص۱۱۷)

وہیں کیف کے مجموعہ ''انگنائی'' پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ان کی شاعری کے درپن میں ہمیں اگر مشرقی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے تو وہیں مغربی تہذیب وتمدن کا جلوہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔'' (غزال.....ص۱۲۰)

مذکورہ مضامین کے علاوہ جیسا کہ کہا جا چکا، کتاب کے اس حصہ میں ''پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی'' پر ایک عمدہ فیچر بھی موجود ہے۔ اس فیچر کا آغاز، موسیقی کے ساتھ اُسی شعر سے ہوا ہے جس کا دوسرا مصرع اس کتاب کا نام ہے اور پھر اکابرین عظیم آباد کا تمہیداً ذکر کرتے ہوئے بیدل کی سوانح وتصانیف اور ضمناً ''بزم سخن'' سائنس کالج پٹنہ اور ''بزم ادب'' پٹنہ کالج پٹنہ کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ اس فیچر میں نہ صرف یہ کہ خدمات بیدل کے باب میں پروفیسر سید حسن کے قول سے ہماری ضیافت ہوئی ہے، بلکہ فیچر نگار نے یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ:

''حضرت بیدل اپنی نظموں میں بھی تغزل کا رنگ بھر دیتے ہیں۔'' (غزال.....ص۶۹)

پیش نظر کتاب کا ''حصہ نثر'' پانچ تحریروں پر محتوی ہے۔ یہاں تین مضامین ہیں اور دو ''فیچر'' اس حصہ کا آغاز ''قاضی عبدالودود'' سے ہوا ہے جس میں

مصنف نے سوانحی وتحقیقی مواد ومطالعہ اوراس کے حوالے واشارے کے ساتھ قاضی صاحب کی زندگی وشخصیت، ان کی غالب شناسی، تحقیق میں اُن کے مرتبےاوررسالہ''معیار'' کےحوالے سےان کی صحافتی ژرف نگاہی دکھاتے ہوئے اردوتحریک سےاُن کا ہمہ جہت تعلق بھی سامنے لادیا ہے۔ ذکرقاضی کے بعد''پروفیسرعبدالمغنی'' کا ذکر ہوا ہے۔اس مضمون کا آغاز قدرے تاثراتی اورتعزیتی انداز سے ہےاور''یادیں اور باتیں'' جیسا لہجہ اپناتے ہوئے یہاں جناب عارفی نے نہ صرف اُن کی سوانح وشخصیت اور اُن کی تصانیف کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک''ناقد، اسلامی مفکر، صحافی و معلم'' کی حیثیت سے انہیں پیش کرتے ہوئے، اُن کے معاصرین کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اردوتحریک سے ان کے قائدانہ تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اُن کا سب سے بڑا کارنامہ بہار میں اردوتحریک کو استحکام بخشااوراردوکودوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانا ہے۔''(غزال......ص۱۳۴)

پھراس حصہ کے تیسرے اورآخری مضمون میں مختصرسوانح اورتصانیف کے تذکرے کےساتھ جناب عارفی نے''شکیلہ اختر'' کی باتیں کی ہیں اوران کی افسانہ نگاری پر پروفیسرعبدالمغنی کی آراکےاقتباسات اورشکیلہ اختر کےمعاصرافسانہ نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئےلکھا ہے کہ:

''شکیلہ اختر بہارکی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے نئ نسل کی ہمت افزائی کے ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کی ہے۔''(غزال......ص۱۷۱)

اتناہی نہیں بلکہ اُن کے اہم افسانوں کے نام اور اُن کی بابت تجزیاتی اشارے کےساتھ جناب عارفی نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

''شکیلہ اختر کے سب سے بزرگ اورمعتبر ہم عصروں میں پریم چندکا نام بھی لیاجاسکتا ہے، دراصل وہ پریم چنداسکول کی ہی پروردہ افسانہ نگار ہیں۔''(غزال......ص۱۷۲)

جیسا کہ کہا گیا، اس کتاب کے''حصہ نثر'' میں مذکورہ تینوں مضامین کے علاوہ دو فیچرز بھی ہیں۔ پہلافیچر''پروفیسراختراورینوی'' پر ہے جس میں اختراورینوی کی سوانح ''پام ولا'' کے ماحول وغیرہ کا قدرے تفصیلی تذکرہ ہی نہیں ہےاور برسبیل بیان عورت کے بارے میں اختر صاحب کی تحریر کا ایک خوبصورت اقتباس ہی نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ جناب عارفی نے اختراورینوی کی افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، شاعری اورتحقیق وتنقید نگاری کا بھی ذکر کیا ہےاور اُن کے کارناموں پر مشاہیر نقدوادب کی آرا بھی حوالہ قرطاس کردیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مصوری کے شوق اوراردوتحریک سےاختر صاحب کی وابستگی کے بارے میں بھی بتایا ہے۔اس فیچر میں عمدہ زبان کا استعمال بھی علی الخصوص متوجہ کرلیتا ہے۔اس کے بعداس حصہ کا دوسرا فیچر''سہیل عظیم آبادی'' کے عنوان سے سامنے آتا ہے جس کا اختتام کلیم عاجز اورجمیل مظہری کے تعزیتی اشعار پر ہوا ہے۔اس خوبصورت فیچر میں سہیل عظیم آبادی کی زندگی، افسانہ نگاری اور شاعری کے دوش بدوش اُن کے ڈرامے، ناولٹ، خطوط، تراجم وصحافت اور بچوں کے لئے ان کی تحریروں کا بھی ذکرآیا ہے جس سے اس کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ دونوں فیچرز کے علاوہ، جیسا کہ ذکر ہو چکا، جناب عارفی کی اس کتاب میں پروفیسرعبدالمنان بیدل عظیم آبادی پر بھی ایک فیچر ہے، اس طرح اس کتاب میں مشمولہ فیچرز کی تعداد تین تک پہنچ جاتی ہےاوراس کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ان کی وساطت سےموسیقی وصدابندی کے اہتمام کے ساتھ نشریہ ادبی فیچر نگاری میں جناب عارفی کی محنت اور اُن کے وطیرۂ فن کا بہ سہولت تمام اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

زیرنظر کتاب میں''صحافت'' کےذیلی عنوان سے دومضامین ہیں۔ پہلے مضمون میں مصنف نے بہار میں اردوصحافت پر تمہیدی سطور کے ساتھ اخبار''قومی تنظیم'' کے بانی''حافظ سیدمحمد عمرفرید'' کی سوانح، ان کے خاندانی احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے جہاں اس اخبار کی ابتدا تا حال پوری تاریخ لکھ دی ہے، وہیں اس اخبار کے بانی کا یہ منشا بھی واضح کردیا ہے کہ اس کی اشاعت سے وہ بہار میں ایک ایسی تحریک کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے جس کے زیراثر بہار میں اردوزبان وادب کوفروغ بھی ملتا رہے اور مسلمانوں کے مسائل بھی حکومت وقت تک پہنچتے رہیں۔ اس مضمون میں برسبیل تذکرہ بعض اہم تاریخی معلومات کی شمولیت نے اسے واقعی بہت وقیع بنادیا ہے۔

پروفیسر عبدالمنان طرزی کے منظوم اقتباس سے زینت یافتہ اس تحریر کے بعد حصہ صحافت کے دوسرے مضمون میں جناب عارفی نے سید عبدالرافع کو ''ایک باشعور صحافی'' کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے، صحافت اور صحافی کے بارے میں تمہیدی سطروں کے ساتھ، ان کے سوانحی کوائف، ان کی منکسر مزاج شخصیت اور ان کی ادارتی صلاحیت و مزیت پر روشنی ڈالی ہے اور انہیں ایک ''بالغ نظر'' اور ''باحوصلہ صحافی'' بتاتے ہوئے، جہاں ایک طرف بر سبیل تذکرہ ''قومی تنظیم'' کے بارے میں ان کے خیالات نقل کیا ہے، وہیں دوسری طرف مضمون کے آخر میں بجاطور پر اہل بہار سے ان کی ناقدری کا شکوہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب میں ذکر ''صحافت'' کے بعد ''دبستان عظیم آباد کے تعلق سے تین اہم کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ'' شامل کیا گیا ہے جو اگرچہ تبصراتی نوعیت کی تحریریں ہیں، مگر ان میں ''سرسری اس جہان سے گزرے'' جیسا فیشن زدہ انداز ہرگز نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ جناب عارفی نے پروفیسر عبدالمنان طرزی کی منظوم کتاب ''دیدہ وران بہار'' (جلد اول تا سوم) پر لکھتے ہوئے جہاں مصنف کی مجموعی ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے، ان کی شاعری کے بارے میں مشاہیر کے خیالات نقل کئے ہیں اور فارسی میں منظوم تاریخ نویسی کی روایت کا اشارہ دیتے ہوئے ''دیدہ وران بہار'' کو ''دبستان عظیم آباد کا شاہنامہ'' قرار دیا ہے، وہیں اس کتاب میں در آنے والے مکررات کی کیفیت اور اُس تسامح کی بھی نشاندہی کر دی ہے جو ضلع پیلی بھیت (اتر پردیش) کے شاعر درگا سہائے سرور جہاں آبادی کو شامل کر لینے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

طرزی صاحب کی کتاب کے بعد اس حصہ میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کی کتاب ''بہار کی بہار'' (جلد اول و دوم) پر مناسب و معقول تمہید کے ساتھ مصنف سے اپنی ذاتی ملاقات اور ان کے شگفتہ و پر اثر انداز گفتگو کا حوالہ لاتے ہوئے جناب عارفی نے جہاں اسے تحقیقی نوعیت کی کتاب بتایا ہے، وہیں از راہ تحقیق و مطالعہ، متعلقہ موضوع پر لکھی جانے والی ان کتابوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو ''بہار کی بہار'' سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، ظاہر ہے کہ اس رویہ سے مذکورہ کتاب کے تجزیہ میں یک گونہ صلابت اور وسعت آ گئی ہے۔

جناب ارشد کی اس کتاب کے بعد ڈاکٹر قیام نیر کی کتاب ''بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) جلد اول و دوم پر، برجستہ تمہید کے ساتھ جناب عارفی کے ذریعہ تجزیاتی نظر ڈالی گئی ہے اور اس کا جامع تعارف پیش کرتے ہوئے جہاں اسے ''عمدہ، مفید و معلوماتی کتاب'' قرار دیا گیا ہے، وہیں اس میں حالیہ انشائیہ نگاروں کو شامل کرنے کی سفارش کر کے گویا بالواسطہ طریقہ سے اس کتاب کو مزید جامع اور تازہ ترین بنانے کی راہ بھی دکھا دی گئی ہے۔ کتابوں کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل اس حصہ کا ایک اچھا پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے جناب عارفی کے تجزیاتی و تبصراتی طرز و مزاج کو سمجھنے میں مزید سہولت مل جاتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا اختتام ''اوراق پارینہ'' پر ہوا ہے جس میں پر مغز علمی تمہید اور تاریخی منظر و پس منظر کے ساتھ ''اردو میں مشاعروں کی روایت اور عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ'' سامنے آتا ہے۔ یہ ''یادگار مشاعرہ'' وہی ہے جس کا ذکر ٹائٹل مضمون میں بھی آیا ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ معلوماتی مواد اور علمی و تاریخی اور تنقیدی استدلال کی کمی نہیں اور اس میں سادہ علمی زبان کے دوش بدوش کہیں کہیں آرائشی اسلوب سے بھی کام لیا گیا ہے جو خاص لطف دے جاتا ہے، مزید یہ کہ مضامین کا حد سے زیادہ طوالت یا اختصار کی بجائے اوسط حجم رکھا گیا ہے جو قاری پر گراں نہیں گزرتا۔

البتہ ان خوبیوں کے باوصف کہیں کہیں بلاغت سے عاری ادعائیت اور تکرار بیان سے بھی سابقہ پڑتا ہے اور کچھ کمپوزنگ کی یا کسی اور نوعیت کی کمی و غلطی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۰۲ پر ''دور جاہلیت میں'' کی جگہ ''دور جہالت مین'' صفحہ ۲۱ پر ''اہمیت'' کی جگہ ''اہمت'' وغیرہ پھر اندرون کتاب غالبؔ کے فارسی شعر کی درست کمپوزنگ کے باوجود سرورق پر اُسی شعر میں ''چوں'' کا ''چہ'' سے بدل جانا، لیکن انسانی کاموں میں تسامحات سے کلیتاً رستگاری ممکن ہی نہیں، اس لئے ان ضمنی باتوں سے قطع نظر بحیثیت مجموعی اسے ایک کامیاب تصنیف کہنے میں کوئی مضائقہ اور یہ امید رکھنے میں کوئی خطرہ نہیں کہ ان کی یہ کتاب اہل ذوق و نظر سے اپنے مرتبہ کا خراج ضرور پائے گی۔

❀❀❀

☆ ''زبان وادب'' جون۲۰۲۴ء موصول ہوا۔ زیرِنظر شمارے کے مضامین بے حد معیاری ہیں خاص کر ''ذکرِ سیمابؔ'' کا حصہ بڑا اہم اور معلوماتی ہے، درخشاں جبیں مبارک باد کی مستحق ہیں۔ اس کے بعد ایم احمد توصیف، ڈاکٹر احمد علی جوہر، سیفی سرونجی، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر محمد ثاقب انور پسند آئے۔ ''یادیں'' کے تحت صدر عالم گوہرؔ، ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ اور ثناءاللہ ثناؔء دوگھروی اپنی تحریروں سے متاثر کر گئے۔ افسانوں میں ''کھنڈروں میں بسے لوگ'' اور ''خوشبو'' نے متاثر کیا۔ منظومات میں ''خداوندا'' حاصل شمارہ ہے۔ اس شمارہ میں اس خاکسار کی بھی آپ نے دوغزلیں شائع فرمائی ہے جس کے لئے بے حد شکریہ! مختار عالم اعظمیؔ، ڈاکٹر اویناش امنؔ، شازیہؔ نیازی اور شمع کوثر شمعؔ کی غزلیں اچھی ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے تحت تبصرے بھی بہتر ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی پسند آیا۔

فردوسؔ گیاوی، گیا

☆ ''زبان وادب'' جون۲۰۲۴ء دستیاب ہوا۔ سرورق پر سیمابؔ اکبرآبادی کی چشم کشا تصویر اور رباعی کے ساتھ ان کے نثری رسالہ ''انمول موتی'' کے صفحہ ادبی کا عکس موجود ہے، جو اس بات کا اشارہ یہ ہے کہ شمارہ کی نگارشات میں سیمابؔ کی ادبی وشعری حیثیتوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور واقعی ایسا ہی ہے۔ اول وآخر کے اندرونی صفحات بھی حفیظؔ بنارسی کی سوانح ورباعیات اور پروفیسر عبدالوہاب اشرفی کے ادبی نقطہ نظر واہم سوانحی نکات سے جگمگا رہے ہیں، جب کہ آخری صفحہ کی پشت پر محمد یونس ہرگانوی اور ناشادؔ اورنگ آبادی کی تصاویر ان کی یادوں کو تازہ کر رہی ہیں۔ اداریہ کے بعد آغاز ''ذکرِ سیمابؔ'' سے ہوتا ہے، جس کی تحت دو مضامین شامل ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون سیمابؔ کے نثری رسالہ ''انمول موتی'' سے تعلق رکھتا ہے، جس میں مضمون نگار درخشاں جبیں نے بہترین اسلوب اور آسان لب ولہجہ میں سیمابؔ کی نثری خدمت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کے ادبی رسالہ کے کیف وکم کو حیطۂ تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس میں شامل پند ونصائح کی افادیت کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے، جب کہ دوسرے مضمون میں سیمابؔ کی شعری حیثیت بالخصوص ان کے مجموعہ رباعیات ''عالم آشوب'' کا تاریخ رباعی کے تناظر میں عالمانہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مضمون نگار ایم احمد توصیف نے یہ بتانے کی سعی جمیل کی ہے کہ سیمابؔ کی رباعیوں کا دامن بڑا وسیع ہے اور ان کے موضوعات کے دائرے میں سیاسیات ومعاشیات، علم وادب، حب الوطنی وحالات حاضرہ کے مسائل، اخوت ومروت، اصلاح وفلاح انسانیت، اخلاق وامن عالم اور تہذیب ومعاشرت کے تمام اجزا سمٹ کر آ گئے ہیں۔ ''مقالات'' کا حصہ چار اصحاب قلم کی نگارشات سے آراستہ ہے، پہلا مقالہ ڈاکٹر احمد علی جوہر کا ہے۔ انہوں نے کرشن چندر کے مشہور ڈرامہ ''سرائے کے باہر'' کا نہایت مبسوط تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ سیفی سرونجی کا مقالہ ''مشرقی تہذیب کا سچا عاشق: اکبرؔ آبادی'' روایتی سہی، مگر لائق مطالعہ ہے اور طلبہ کے لئے مفید وکارآمد ہے۔ ڈاکٹر آفتاب عالم نے بدرؔ اورنگ آبادی کی نثری خدمات کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور ان کے افسانوں پر گفتگو بڑھاتے ہوئے اس کمال کو روشن کیا ہے کہ وہ ایک سچے اور حقیقت پسند فنکار تھے۔ اسی باعث مختلف ناقدین عصر مثلاً نظام صدیقی، پروفیسر عبدالوہاب اشرفی، پروفیسر عبدالمغنی، کلام حیدری، ڈاکٹر فصیح ظفر، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر رضوان احمد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر قاسم فریدی، سید ظفر ہاشمی، عبدالرافع، عشرت ظہیر، ڈاکٹر قیام نیر اور خورشید حیات وغیرہم نے انہیں عہد حاضر کا ایک اہم منفرد اور قابل قدر افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ثاقب انور کا مقالہ ''بیدی کے ببل پر ایک نظر'' بھی مختصر، مگر جامع مقالہ ہے۔ ''یادیں'' کے تحت تین اصحاب قلم کی تحریروں کو شمولیت کا شرف ملا ہے۔ یہاں ایک طرف صدر عالم گوہرؔ نے سلام بن رزاق کی شخصیت وادبی خدمات کو

حیطہ تحریر میں لاتے ہوئے ان سے اپنی دیرینہ ملاقات و مراسم کی یادیں تازہ کی ہیں تو دوسری طرف ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ نے یونس ہرگانوی کی یادوں کے چراغ روشن کرتے ہوئے ان کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جب کہ ثناء اللہ ثناؔء دوگھروی نے ناشاؔد اورنگ آبادی کی شعری خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی وسیع الاخلاقی، شرافت نفسی، خوردہ نوازی اور سادہ و بے لوث سیرت وسوانح کے خوبصورت گلدستے سجائے ہیں، بالخصوص ان کی شاعرانہ خوبیوں کو خود ان کی مختلف سطروں سے مدلل طور پر واضح کیا ہے۔ بعدازیں افسانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ افسانہ ''کھنڈروں میں بسے لوگ'' میں رفیع حیدر انجم نے ذہنی کھنڈروں کی سیر کرائی ہے اور بدلتے وقت کے ساتھ نئی ذہنی تبدیلی کی عکاسی کی ہے۔ انیس احمد صدیقی کا افسانہ ''شاہین'' بھی عبرت آور اور بہترین تخلیق ہے اور شاہین کی ہمت ودلیری پر مشتمل ہے جو باپ کے انتقال کے بعد سرکس میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد صبح وشام خطروں سے کھیلتی اور بیوہ والدہ کی کفالت کرتی ہے۔ راجہ یوسف کا افسانہ ''خوشبو'' نفسیاتی پہلوؤں کی گرہیں کھولتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ احساس خطا انسان کو کف افسوس ملنے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہ احساس اس شخص کے اندر کروٹ لیتا ہے جس میں انسانیت و ہمدردی کی چنگاری موجود ہوتی ہے۔ ''منظومات'' کا کالم طویل و پرحجم ہے اور ماشاء اللہ تیرہ شعرا و شاعرات کے کلام سے مزین۔ یہاں تمام غزلوں میں کلاسیکیت اور جدیدحسیت کی عکاسی ملتی ہے جو یقیناً مسرت وشادمانی کی بات ہے۔ پانچ شعروں پر مشتمل شمع کوثر شمع کی غزل خوب ہے، مگر تیسرے شعر کا مصرع ثانی وزن سے ساقط ہو گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

غالبؔ جگرؔ فراقؔ تو ٹھہرے شہ غزل
کچھ کم نہیں کلام بھی دلِ داغ دار کے

یہاں ناموزونیت کو ختم کرنے کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی شکل تو یہ ہے کہ لفظ ''کلام'' کے بعد آنے والے لفظ ''بھی'' کو خارج کر دیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصرع زور کلام کے حسن سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ لفظ ''کلام'' کو ''سخن'' سے بدل دیا جائے۔ اس صورت میں مصرع موزوں بھی ہو جائے گا اور زور کلام کی خوبی بھی اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ اس کے علاوہ دیگر مشمولات لائق تحسین و قابل مطالعہ ہیں۔ مبصرین حضرات کے تبصرے بھی محنت و دماغ سوزی کے مظہر ہیں اور ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی سبق آموز، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ وفیات کے تحت آپ نے دو معتبر ادیبوں کی دائمی مفارقت پر بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ زیادہ والسلام

عبدالرزاق پیکر رضوی، پٹنہ

☆ جون ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' دستی طور پر موصول ہوا۔ لوح سے تمت تک شمارہ خوب ہی خوب ہے۔ سرورق کا ظاہری اور معنوی حسن اُس وقت گویا اجمال سے تفصیل میں آجاتا ہے، جب ادارتی صفحہ کے بعد ''ذکر سیمابؔ'' کے اوراق سامنے آتے ہیں۔ اس حصہ نے تو گویا اس شمارے کو خاص دستاویزی بنا دیا ہے۔ اس حصہ میں اگر چہ صرف دو ہی مضامین ہیں، لیکن بہت ہی معلوماتی اور بہت ہی منفرد ہیں۔ ''سیمابؔ کا نثری رسالہ: انمول موتی'' پر لکھتے ہوئے درخشاں جبیں صاحبہ نے واقعی بڑی ژرف نگاہی اور محنت ومتانت کے ساتھ اس کتابچہ کا تعارف آئینہ کر دیا ہے۔ کم از کم مجھ جیسے قاری کو تو سیمابؔ کے اس رسالہ پر کوئی مضمون پڑھنا کیا، اس رسالہ کا نام بھی پہلی بار سننا نصیب ہوا۔ اس نوعیت کی تالیفات میں انتخاب اقوال کی ترجیح کا سوال بہر حال خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس میں مؤلف کی نظر اور نظریہ کے اثر ونفوذ سے انکار نہیں ہوسکتا، بایں جہت اس مضمون کے آخری حصہ کی تصریحات نے بہت متاثر کیا کیوں کہ یہاں کئی ایسے نکات کی تلاش کر لی گئی ہے جو اس رسالہ کی اہمیت وافادیت کا معترف بنا لیتے ہیں، پھر یہ کہ کئی اہم صفحات کے عکس کے ساتھ آپ نے اسے خاص اہتمام سے شائع کر کے مزید مفید معلومات اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ اسی طرح ''سیمابؔ: عالم آشوب کا شاعر'' کے عنوان سے جناب ایم احمد توصیف کا مقالہ بھی یقیناً جالب توجہ قرار پاتا ہے۔ سیمابؔ کی رباعیوں کے اس مجموعہ پر مختصر، لیکن جامع اظہار خیال کے بعد مقالہ نگار نے جو مجموعی نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے اختلاف کا سوال

ہی نہیں کہ سیمابؔ کی شاعری بہرصورت بہرتفرج نہیں بلکہ بہرتعلیم و پیام ہے اور اس لحاظ سے ''عالم آشوب'' کی رباعیاں اپنا خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ ''مقالات'' کے تحت ڈاکٹر احمد علی جوہر کے قلم سے کرشن چندر کے ڈرامے ''سرائے کے باہر'' کا تجزیاتی مطالعہ بھی بہت جامع اور کامیاب ہے۔ جناب سیفی سرونجی نے اکبر الہ آبادی پر، ڈاکٹر آفتاب عالم نے ''بدرؔ اورنگ آبادی کی نثری خدمات'' پر اور ڈاکٹر محمد ثاقب انور نے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی ''ببل'' پر جو مضامین لکھے ہیں، وہ بھی اپنے اپنے انداز میں لائق ستائش ہیں۔ جناب صدر عالم گوہرؔ نے سلام بن رزاق کی یادیں بڑی دل سوزی کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور مزید عمدہ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ان کی افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری اور ادبی بزم کے بگڑتے ماحول کو بروقت سنبھال لینے کی صلاحیتوں کا ذکر بھی چھوٹا نہیں ہے۔ اس مضمون کے آخر میں سلام کے افسانہ ''ندی'' پر جو فیلر دیا گیا ہے، وہ بھی بہت برجستہ محسوس ہوا۔ ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ نے ''محمد یونس ہرگانوی پر اور جناب ثناء اللہ ثناءؔ دوگھروی نے ناشادؔ اورنگ آبادی پر جو مضامین لکھے ہیں، وہ بھی بہرکیف مطالعہ کو آسودگی بخشتے ہیں۔ ''کھنڈروں میں بسے لوگ'' سے لے کر ''شاہین'' اور ''خوشبو'' تک اس شمارے کی تینوں ہی کہانیاں نہایت کامیاب ہیں اور ان کے تعلق سے ''حرف آغاز'' میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میری نظر میں بھی بالکل ٹھیک ہے۔ رفیع حیدر انجم، رئیس صدیقی اور راجہ یوسف صاحبان یقیناً مبارکباد کے حقدار ہیں۔ شعری حصہ میں فخرؔ مہدانوی کی نظم ''خداوندا......'' بار بار پڑھا، اس کا اپنا مناجاتی رنگ، حسن تکرار کی بدولت کچھ خاص ہی خاص ہے۔ آپ نے یہ بھی بہت اچھا کیا ہے کہ لگ بھگ سو سال پہلے، ہماری دنیا چھوڑ جانے والے اس شاعر کا چند سطری تعارف بھی دے دیا ہے۔ اس حصہ میں اس بار نظموں کی تلاش تو بار آور نہیں ہوئی، البتہ کئی خوبصورت فیلرز کے ساتھ، دس شاعروں کی غزلیہ سوغات نے اس کمی کا یہ احساس کافی حد تک دور کر دیا۔ زیر نظر شمارے میں تبصرے کا حصہ بھی معیاری ہے اور بچوں کے لئے اشاعت پانے والا حصہ بھی۔

(ڈاکٹر) شائستہ خاتون، بہار شریف

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۲۴ء ملا۔ شمارہ ہر اعتبار سے نہایت خوبصورت اور لائق مطالعہ ہے۔ اس میں بڑوں کے لئے جو کچھ ہے، وہ اپنی جگہ، بچوں کے لئے بھی آپ نے کچھ کم محنت سے اچھی اچھی چیزیں یکجا نہیں کر دیا ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' صرف رنگین ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے دامن میں ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ اور فائدہ مند تحریریں لئے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر مہینے اس رسالہ کے تازہ شمارے کا ہمیں بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اس بار اس حصہ کی شروعات امیر احمد خسروؔ کی دعائیہ نظم سے ہوئی ہے۔ اس ''دعا'' کے ایک ایک مصرعے ایسے پیارے ہیں کہ ان پر سچ مچ سو سو بار آمین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ''محبت کی دنیا ہو، دنیا خدایا'' اور ''ہر انساں کو دنیا میں جینا سکھادے'' جیسی آرزو اور التجا بھلا کس انسان کے دل میں نہیں ہوگی اور بھلا کون ہے جو اپنے پاک پروردگار سے بار بار یہ کہنا نہیں چاہے گا کہ ؎

خوشی کا الٰہی زمانہ وہ آئے
جو دنیا کو رہنے کے قابل بنا دے
ستائے نہ افلاس و غربت کسی کو
ہو نہ بے جا غرورِ امارت کسی کو
سب انسان آپس میں ہوں بھائی بھائی
یہ نفرت مٹے اور مٹے ہر برائی

بہت ہی آسان الفاظ اور آسان انداز میں لکھی گئی اس ''دعا'' والے صفحہ پر ہی خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی نظم ''مٹی کا دیا'' بھی خوبصورت عکس کے ساتھ فیلر کے طور پر پڑھنے کو ملی۔ نظم کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا قصہ ہے، اُس بڑھیا کا قصہ جس نے سر راہ ایک دیا اس جذبے اور اس مقصد سے جلا دیا تھا کہ اندھیرے میں مسافر ٹھوکر نہ کھائیں۔ حالیؔ کے اشعار پڑھ کر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یاد آئی کہ تکلیف دینے والی چیزوں کو راستے سے ہٹا دینا نیکی ہے۔ اندھیرا تکلیف دینے والا تھا، بڑھیا نے ایک دیا جلا کر اسے راستے سے ہٹا دیا تو پھر وہ دیا اُس جھاڑ اور فانوس سے بہتر کیوں نہ ہو، جس کی روشنی محل سے باہر نہیں آتی۔ مجھے حالیؔ کے یہ اشعار پڑھ کر ایسا لگا، جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ صرف اپنے گھر آنگن میں اجالے سے ہی مطلب مت رکھو،

بلکہ پڑوس اور سماج میں بھی اُجالا لانے کی فکر کرو، پھر صفحہ ۸۰ پر سیمابؔ اکبرآبادی کی کتاب ''انمول موتی'' سے لئے گئے ''کارآمد اشعار'' والا فیلر بھی بہت قیمتی ہے۔اسے پڑھتے ہوئے اچانک خیال گیا، سرورق کی طرف اور اس شمارے کے اُس پہلے مضمون کی طرف، جسے محترمہ درخشاں جبیں صاحبہ نے لکھا ہے۔شوق میں یہ مضمون بھی پورا پڑھ لیا اور سچ پوچھئے تو اس میں جو نثری اقوال دیے ہوئے ہیں، وہ نہال کر گئے، ایسا لگا کہ میں وہ سطریں نہیں پڑھ رہی ہوں، بلکہ میرا ذہن موتی رول رہا ہے۔بہرحال! پھر آتی ہوں ''بچوں کا زبان ادب'' کی طرف۔یہاں جناب تنویر اختر رومانی نے الباب کی جو کہانی لکھی ہے اس میں بڑا سبق ہے ''لالچ کا پھل'' بس کڑوا ہی کڑوا ہوتا ہے۔پیسے کی لالچ تو اور بھی بری بلا ہے، اس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، ذلت ہی ذلت ہے۔اس شمارے میں ''سندیسا کھوپڑی کا'' کے عنوان سے ایک اور کہانی بھی پڑھنے کو ملی، جسے جناب محمد ریحان نے لکھا ہے اور یہ کہانی بھی بہت پسند آئی، ذرا نئے ڈھنگ کی کہانی ہے اور اس میں کرداروں کی زبان کے لحاظ سے ہندی لفظوں کا استعمال بہت اچھا لگا۔کہانی کی آخری سطریں تو ایسی ہیں کہ آدمی سدا کے لئے انہیں گرہ میں باندھ لے: ''بیشک کرم کا پھل مل کر رہتا ہے اور یہیں دیکھنے کو مل جاتا ہے اور کرم برا ہو تو کیا ندی کنارے سے اور کیا اونچے مچان سے، ہر حال میں وہ سنڈاس یعنی نرک تک لے ہی جاتا ہے۔'' اس کہانی میں ساوتری کی ماتاجی نے کتنی بھلی بات سکھائی ہے کہ: ''بیٹی! جو ہوا، جو دیکھا اس سے عبرت لو، جیون سکھی رہے گا۔اپنے میکے، سسرال، اپنی پڑھائی اور کسی بات پر کبھی گھمنڈ مت کرنا، گھمنڈ چور چور ہو جاتا ہے۔'' یہاں دونوں فیلر یعنی ''بیٹھے بچن سنائے کے.....'' اور ''دل کی لگن اور اس کا ثمرہ'' بڑی اچھی اور اونچی سیکھ دے رہا ہے۔جناب پرویز اختر کا مضمون ''قربانی اور کامرانی کا رشتہ و مرتبہ'' بھی پسند آیا۔اسی طرح ''زبان کی الٹی چال'' کے عنوان سے جناب توحید اختر کا مضمون بھی بہت ہی اچھا ہے۔بات بالکل ٹھیک ہے کہ ایثار و قربانی کے بغیر دنیا کی زندگی میں کوئی بات نہیں بنتی ہے اور کامیابی کا بڑا راز اعضا و جوارح سے نیک کام لینے، خصوصاً زبان کے اچھے استعمال ہی میں چھپا ہے۔زیادہ حد ادب!

ترنم جہاں، سمستی پور

☆ ''زبان و ادب'' کا شمارہ مئی ۲۰۲۴ء پیش نظر ہے۔میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ رسالہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوب تر ہے۔ہر ماہ اردو ادب کی کسی ایک اہم شخصیت پر رسالہ میں آپ جو گوشہ لا رہے ہیں وہ بے حد قیمتی دستاویز ہے۔اس مرتبہ دلؔ عظیم آبادی پر گوشہ شامل ہوا ہے جو بجائے خود خاصا اہم ہے۔اندرونی سرورق پر صفیرؔ بلگرامی کا مختصر تذکرہ بھی ان کی تصویر کے ساتھ کافی ہے۔صفیرؔ بلگرامی کے سلسلے میں یہاں ایک بات گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ صفیرؔ نے ایک مرتبہ آرہ سے سہسرام کا سفر کیا تھا۔سفرِ سہسرام کے تعلق سے انہوں نے ایک نظم بعنوان ''نظم در تعریف سہسرام'' لکھی تھی جو طبع نہ ہو سکی تھی۔مختلف ہاتھوں سے گھومتا ہوا اس نظم کا قلمی نسخہ پروفیسر اطہر حسین صاحب (بانی شیخ کرامت لائبریری سہسرام و سابق صدر شعبہ اردو ایس پی جین کالج، سہسرام) تک پہنچا، جس پر پروفیسر کلیم سہسرامی (شعبۂ السنہ راجشاہی یونیورسٹی، بنگلادیش) کی نظر پڑی۔انہوں نے اس پر ایک بسیط تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا اور دنیائے اردو کو اس سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے صفیرؔ پر تحقیقی کام کیا ہے، مگر ان کے یہاں بھی اس کا ذکر نہیں۔البتہ مشفق خواجہ نے سید وصی احمد بلگرامی کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کرتے ہوئے جو فہرست مرتب کی تھی اس میں اس کا ذکر ہے، مگر انہوں نے اسے مثنوی گردانا ہے اور اشعار کی تعداد ۱۶۴ بتائی ہے، جب کہ اس میں اشعار کی تعداد ۱۶۶ ہے۔مزید یہ کہ مشفق خواجہ صاحب کا اسے مثنوی بتانا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ مثنوی کے فارم میں نہیں ہے۔اسے پروفیسر کلیم سہسرامی کی تحقیقی دریافت کہا جائے گا کہ وہ اس نظم کو منظر عام پر لائے۔ان کا یہ مقالہ مع پوری نظم ان کی کتاب ''روایت و درایت'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جسے راقم الحروف (اشفاق عادل) نے مرتب کیا ہے۔اسی کتاب میں صفیرؔ بلگرامی کے تعلق سے ایک اور مضمون ''صفیرؔ بلگرامی کی ایک بیاض'' بھی ہے، جو صفیرؔ شناسی میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔سلطان آزاد کے مضمون ''رشید النساء اور اصلاح النساء: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے

عنوان میں ''اور'' کی جگہ ''کا'' ہوتا تو بہتر ہوتا کیونکہ اس عنوان سے ایسا لگتا ہے کہ وہ مصنف اور تصنیف دونوں کا تجزیہ کررہے ہیں جب کہ مقصود صرف ناول کا تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مقالہ ''اردو کا پہلا ناول نگار'' بے حد محنت سے لکھا گیا ہے۔ فکشن کی تنقید ان کا خاص میدان ہے۔ شعری حصہ میں بدرؔ محمدی اور شاہد اخترؔ کے یہ اشعار اچھے لگے ۔

دلوں میں رہنے کا موسم بھی آئے گا اک دن
یہ کم نہیں کہ مرے ساتھ تو سفر میں رہا

(شاہد اخترؔ)

ہونٹوں کے عوض کام کیا کرتی ہیں پلکیں
خاموشی نگاہی کا جہاں اور ہی کچھ ہے

(بدرؔ محمدی)

کافی دنوں بعد حضرت طلحہ رضوی برقؔ کے کلام کو پڑھنے کا موقع ملا۔ برقؔ صاحب اور آثرؔ فاطمی کی رباعیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ رباعی نگاری کے لئے کہنہ مشق ہونا کتنا ضروری ہے —— اب آیئے جون ۲۰۲۴ء کے شمارے کی طرف! یہ شمارہ بھی مئی ۲۰۲۴ء کے شمارے کی طرح گونا گوں مشمولات سے مزین ہے۔ سیمابؔ اکبرآبادی ایک نابغہ روزگار تھے۔ ان کا ذکر گویا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے۔ درخشاں جبیں نے ''سیمابؔ کا نثری رسالہ: انمول موتی'' میں سیمابؔ کے نئے پہلو پر قلم اُٹھایا ہے اور ایم احمد توصیف کا مقالہ سیمابؔ اکبرآبادی کی رباعی گوئی پر ''سیمابؔ: عالم آشوب کا شاعر'' اگرچہ مختصر ہے، مگر کارآمد ہے۔ ایک طرف سیمابؔ جیسا شخص جسے بجا طور پر ایک دبستان کہا جاسکتا ہے تو دوسری طرف پروفیسر وہاب اشرفی جیسا دوسرا نابغہ روزگار۔ ایک قدیم تو دوسرا جدید دور کا انسائیکلو پیڈیا۔ رفیع حیدر انجم کافی دنوں سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا افسانہ ''کھنڈروں میں بسے لوگ'' نے دیر تک اپنی گرفت میں رکھا۔ ثناء اللہ دوگھروی نے ناشادؔ اورنگ آبادی کی یادیں تازہ کردیں۔ اس بار کے شعری گلدستے میں ہر بار کی طرح مختلف رنگوں کے پھول ہیں۔ ڈاکٹر اویناش امنؔ اور فردوسؔ گیاوی کے یہ اشعار لطف دے گئے ۔

زمیں کا بستر، فلک کا سایہ، ندی کا پانی، بدن پہ خرقہ
یہ وہ مزہ ہے جہاں میں جس کو کسی نے سمجھا کسی نے جانا

(اویناش امنؔ)

نباہ کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی
بس ایک بار محبت سے اس نگاہ کو چوم

(فردوسؔ گیاوی)

مگر حیرت ہے کہ مقطع میں ''کلام'' قافیہ کی جگہ پر کیسے آگیا؟ شاید یہ لفظ ''کلاہ'' ہوگا، جس پر کمپوزنگ کی خاص عطا ہوگئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب، برادرم سعیدؔ قادری کی غزل میں ''عین شین قاف'' سے زبان کا ذائقہ بگڑ گیا۔ عین شین قاف کی گردان سے وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اشفاق عادل، پٹنہ

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' اپریل ۲۰۲۴ء نظر نواز ہوا۔ سرورق سے لے کر پس ورق تک شمارے میں شامل مواد آپ کی ان کاوشوں کا ثبوت ہے جو آپ ''زبان وادب'' کو سنوارنے کے لئے بروئے کار لا رہے ہیں، خاص طور پر آپ کے نظم ونسق میں اس کا طباعتی حسن بھی نکھر گیا ہے۔ اس شمارے کے تمام حصے حسب سابق بے حد عمدہ ہیں۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ پچھلے دنوں ماہنامہ ''زبان وادب'' نومبر ۲۰۲۳ء میں میری چند نظمیں شائع ہوئی تھیں، اس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ومشکور ہوں۔

سلطان احمد ساحلؔ، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	معصوم دل کی دعا	صبؔا نقوی	۷۴
☆	قوس قزح کی کہانی	جہانگیر اُنس	۷۵
☆	آزادی	ثنا ثمرین	۷۷
☆	......اے پرچم لہرائے جا	ابراہیم ہوشؔ	۷۸
☆	دو حکمراں، دو کہانی	محمد رضوان احمد	۷۹
☆	پیڑ لگائیں	نصیر احمد عادلؔ	۸۰
☆	حج مبارک	التفات رضا	۸۰

صبا نقوی

معصوم دل کی دعاء

معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — جود و سخا کے نام پر، لطف و کرم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — حسن عطا کے نام پر لوح وقلم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — خاک شفا کے نام پر، خاک قدم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — کرب وبلا کے نام پر، عرفان غم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — شیر خدا کے نام پر تیغ دو دم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — بخت رسا کے نام پر، جاہ وحشم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — خیرالنسا کے نام پر، خوان ارم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — صدق و صفا کے نام پر، نازونعم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — شمع حرا کے نام پر ، نور حرم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ — مہر و وفا کے نام پر، مشک وعلم کی بھیک دے

❀❀❀

(ماهنامہ "زبان وادب" پٹنہ، ج ۳۷، ش ۱۰، ص۸۰)

ناک اس کی کٹ گئی

اک دن نبی نے حلقہ احباب میں یہ لفظ — دہرائے تین بار کہ ناک اس کی کٹ گئی
اصحاب نے کہا کہ یہ کم بخت کون ہے — توقیر جس کی حضرت باری میں گھٹ گئی
ارشاد یوں ہوا کہ وہ فرزند ناخلف — گھر جس کے جنت آئی اور آ کر پلٹ گئی
ماں باپ کا جسے نہ بڑھاپے میں ہو خیال — اس ناسعید بیٹے کی قسمت الٹ گئی

—— ظفر علی خاں

جہانگیر اُنس
At. Ranipur, P.o.- Barharia, Dist- Siwan -841232 (Mob. 9162357830)

قوس قزح کی کہانی

فائزہ بڑی بہن تھی، رمیز اور نفیس دو چھوٹے بھائی تھے۔

تینوں بھائی بہن ایک سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔ فائزہ چھٹے کلاس میں تھی، رمیز پانچویں کلاس میں اور نفیس چوتھے کلاس میں۔ والد ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھے اور والدہ گھریلو خاتون تھیں۔

تینوں بھائی بہن ایک ہی ساتھ پیدل اسکول جاتے اور ایک ہی ساتھ اسکول سے واپس آتے۔ تینوں نہایت ہی تمیز دار بچے تھے۔ تینوں اسکول سے واپس آنے کے بعد ایک مخصوص الماری میں اپنی کتابیں اور کاپیاں سلیقے سے رکھتے، اسکول کا یونیفارم تبدیل کر کے گھریلو کپڑا پہنتے اور منہ ہاتھ دھو کر اطمینان سے بیٹھ جاتے۔

والدہ گرم اور تازہ ناشتہ سامنے لاکر رکھ دیتیں۔ تینوں ناشتہ کرتے، پھر کچھ دیر آرام کرتے اس کے بعد ماں سے اجازت لے کر سامنے بنے پارک میں کھیلنے چلے جاتے۔ مغرب کے وقت تک پارک میں رہتے۔ اس کے بعد گھر آتے، ماں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے اور اپنی اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر پڑھنے بیٹھ جاتے۔

اس دن بھی تینوں معمول کے مطابق ماں سے اجازت لے کر پارک میں کھیلنے گئے۔ نفیس نے فائزہ سے کہا:

''آپا میں کاغذ کا جہاز بنا کر ہوا میں اڑاؤں گا۔''

رمیز کیوں پیچھے رہتا، اس نے کہا: ''میں بھی کاغذ کی ناؤ بنا کر تالاب میں تیراؤں گا۔''

دونوں اپنا اپنا کام کرنے لگے اور فائزہ دونوں کی مدد کرنے لگی۔ نفیس کا کاغذی جہاز پہلے تیار ہوگیا۔ فائزہ نے کہا:

''پہلے نفیس کا جہاز ہوا میں اُڑاتے ہیں اس کے بعد تینوں مل کر رمیز کی ناؤ پانی میں تیرائیں گے۔'' اور پھر نفیس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا جہاز ہوا میں اُڑا دیا۔ تینوں آسمان کی طرف دیکھنے لگے، مگر اچانک ان کی نظریں آسمان پر اٹک گئیں۔ وہاں پورب کی طرف نہایت ہی خوش نما منظر نظر آرہا تھا۔ ہلکے دائرے کی شکل میں مختلف رنگوں کی شوخ اور گہری لکیریں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ فائزہ نے کہا:

''گھر چلو، ماں کو بھی یہ منظر دکھاتے ہیں اور اُن سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے......؟''

تینوں واپس گھر آئے۔ انہیں دیکھ کر ماں نے کہا:

''آج تم لوگ بہت جلد لوٹ آئے، کیا بات ہے؟''

''ماں! آسمان پر ایک بہت خوبصورت منظر نظر آرہا ہے۔ ہم نے آج سے قبل آسمان پر ایسا خوبصورت منظر نہیں دیکھا تھا۔ آپ بھی دیکھئے اور بتایئے یہ کیا ہے؟'' تینوں نے بیک زبان کہا۔

ان کی ماں نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولیں: ''یہ قوس قزح ہے، ہندی میں اسے اندر دھنش اور انگریزی میں رین بو (Rainbow) کہتے ہیں، پہلے دیہات میں اسے ست رنگا کہتے تھے۔ بڑے بوڑھے بچوں سے کہتے یہ ہاتھی کا سونڈ ہے اور آسمان سے پانی نکالتا ہے۔ یہ اکثر برسات کے دنوں میں نظر آتا ہے۔ بڑے بزرگ کہتے تھے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اب بارش نہیں ہوگی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ اندر کا دھنش ہے۔ یہ صبح یا شام کو ہی نظر آتا ہے۔''

فائزہ، رمیز اور نفیس کی ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں، انہوں نے بچپن میں دوسروں کی زبان سے قوس قزح کے متعلق جو باتیں سنی تھیں، وہ بچوں کو بتادیں، مگر آج کے سائنسی دور کے بچے ان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ قوس قزح کے متعلق ان کے دلوں میں ایک طرح کا تجسس پیدا ہوگیا تھا اور وہ اس کے متعلق تفصیل سے جاننا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا جب ابا گھر آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ قوس قزح آسمان میں کیوں نظر آتا ہے اور اس میں کتنے رنگ ہوتے ہیں۔

ماں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد تینوں اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر پڑھنے بیٹھ گئے، مگر کتابوں اور کاپیوں کے بجائے ان کا دل قوس قزح میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ دیوار میں لگی گھڑی پر بھی نظر ڈالتے رہتے کہ کب ان کے ابا کے آنے کا وقت آتا ہے۔

ان کے والد اپنے مقررہ وقت پر گھر میں داخل ہوئے۔ بچوں نے انہیں سلام کیا۔ حسب عادت انہوں نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا، اپنا بیگ ٹیبل پر رکھ کر کپڑا تبدیل کیا اور واش روم میں چلے گئے۔

اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہ ٹیوشن پڑھانے چلے جاتے تھے، اس لیے انہیں گھر آنے میں تاخیر ہوتی تھی۔ ان کا معمول تھا کہ کچن میں چائے پینے کے بعد وہ تینوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ اگر کسی کو کسی سوال کے حل کرنے میں دشواری ہوتی تو وہ اس کی مدد کرتے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ بچوں کے پاس آ کر بیٹھے ہی تھے کہ نفیس نے سوال کیا:

''ابا! قوس قزح کیا ہے......؟ کیسے بنتا ہے اور اس میں کتنے رنگ ہوتے ہیں؟''

''تمہیں قوس قزح کا کیسے خیال آ گیا۔ کیا تمہاری کتاب میں قوس قزح کا ذکر ہے......؟''

انہوں نے نفیس سے پوچھا، مگر تینوں ایک ساتھ کہنے لگے:

''آج ہم نے آسمان میں ایک دلکش منظر دیکھا ہے۔ اماں نے اس کا نام قوس قزح بتایا ہے۔''

''ہاں......! بارش ہونے کے بعد پانی کے جو قطرے فضا میں معلق رہ جاتے ہیں ان پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ منعکس ہو کر قوس قزح کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ قوس قزح دیکھنے والے کی پیٹھ کے پیچھے سورج ہونے پر دکھائی دیتا ہے۔ پانی کی ایک بوند میں دو سطحیں

ہوتی ہیں۔ سورج کی کرنیں جب پانی کے بوند کے اندر داخل ہوتی ہیں تو پہلی سطح سے ٹکرا کر وہ تھوڑا جھک جاتی ہیں۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ رنگوں کے یہ بنڈل پانی کی بوند میں داخل ہونے کے بعد اپنے رنگ کے حساب سے جھلکنے لگتے ہیں اور ساتوں رنگ نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ ایک سائنسی ردعمل ہے۔''

اپنی باتیں ختم کر کے انہوں نے پوچھا:

کیا تم لوگ یہ بتا سکتے ہو کہ سورج کی کرنوں میں کون سے سات رنگ ہوتے ہیں؟''

تینوں بھائی بہن ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔

''ابھی ابھی کی تو بات ہے، تم لوگوں نے قوس قزح میں ان ساتوں رنگوں کو دیکھا ہے۔''

تینوں بھائی بہنوں سے رنگوں کو بتانے کی کوشش کی، لیکن کوئی بھی تین یا چار رنگ سے زیادہ کا نام نہیں بتا سکا۔

ابا نے کہا: ''انگریزی کا ایک لفظ "Vibgyor" ہے اس میں سات حروف ہیں اور ہر حرف سے ایک رنگ کا نام بنتا ہے، جو سورج کی کرنوں میں شامل ہے اور قوس قزح میں نظر آتا ہے۔''

V	Violet	(بیگنی رنگ)
I	Indigo	(نیلے اور بیگنی کا درمیانی رنگ)
B	Blue	(نیلا رنگ)
G	Green	(سبز ہرا رنگ)
Y	Yellow	(پیلا رنگ)
O	Orange	(نارنجی یا نارنگی رنگ)
R	Red	(لال رنگ)

اپنی بات ختم کر کے ابا نے کچھ دیر تک بچوں کی طرف دیکھا ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے کہا:

''بچو! مجھے تمہاری اس تجسس پسندی پر فخر ہو رہا ہے۔ جن بچوں میں نئی نئی باتیں جاننے کی خواہش رہتی وہ زندگی میں کافی ترقی کرتے ہیں، چیزوں کے متعلق جاننے سمجھنے اور عمل کرنے کا جذبہ انسان کو آگے بہت دور تک لے جاتا ہے۔ ❀❀

ثناثمرین
Middle School, Shahpur, Sasauna, Dist. Samastipur- 848131

آزادی

ہمارے اردو داں نونہالو! مضمون کا عنوان تمہارے سامنے ہے۔ ''آزادی'' کے لفظ کا دوسرا حرف ''ز'' نقطہ والا ہے اور دوسرے حروف نقطہ سے خالی سادہ حروف۔ اس قسم کا لفظ ''فوق نقطہ موحدہ'' کہلاتا ہے مثلاً ''وطن''، ''دامن'' اور دوسرے الفاظ وکلمات۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ''آزادی'' کے تعلق سے اس مضمون کے لئے ذرا خاص اہتمام اس طرح ہوا ہے کہ کوئی لفظ اگر ہے تو وہ فوق نقاط حرف والا ہے، ورنہ سادہ حروف والا، اسے تم آسانی سے محسوس کر سکتے ہو۔

آزادی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی انوکھی اور انمول نعمت ہے اور اس کی قدر ومنزلت کا شعور رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہمارے لئے از حد ضروری ہے۔ ''آزادی'' کا لفظ فارسی لغت سے ہم کو ملا ہے۔ اس کی ہندی ''سوتنتر'' ہے۔ لفظ آزادی کی ضد غلامی ہے اور دونوں ہی لفظ مؤنث ہے۔

ہم کو معلوم ہے کہ سن اٹھارہ سو ستاون کی لڑائی ناکام ہوئی تو اس شکست نے ہمارے وطن کی آزادی ختم کر دی۔ ہمارا ملک ہندوستان گوروں کی حکمرانی کے ماتحت ہوا اور ہم ان کے غلام ہو گئے۔ آخری مغل حکمراں شہنشاہ ظفر معزول ہوئے، گرفتار ہوئے اور آخر کار ان کو رنگون کی کال کوٹھری ملی اور رنگون ہی ان کے لئے آخری آرام گاہ مقدر ہوئی۔

غور کرو، اس کٹھن دور کا تصور کتنا مشکل اور دردناک ہے کہ ہمارا وطن آزادی کی دولت سے محروم ہوا اور حکومت ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی، مگر ہم نے ہمت کا دامن تھام رکھا تھا۔ فرنگی حکمرانوں نے ظلم وستم کی انتہا کر دی، مگر ہم ہندوستانی رات دن طرح طرح سے وطن کی آزادی کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ نہ تو ہمارے قدم لڑکھڑائے، نہ ہی ہماری ہمت کمزور ہوئی۔ ہمارے رہنماؤں نے انتہائی حوصلے، عقلمندی اور ذہانت سے وطن کی خاطر آزادی کا مشن زندہ رکھا اور نوے سال تک مسلسل کاوش ومحنت کرتے رہے، اندولن ہوتا رہا، سول نافرمانی ہوتی رہی۔ ہندو مسلم، سکھ غرض کہ سارے ہندوستانی ان کے ساتھ رہے۔

آزادی کی لڑائی کے وقت اگر شہدا کے لہو ارزاں ہوئے تھے اور احمد اللہ شاہ مدراسی اور حضرت محل اور ان کی طرح ان گنت مردوں اور عورتوں نے فرنگی حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور عملی اقدامات کئے تھے تو آزادی کے لئے طرح طرح کے اندولن مثلاً ''ترک موالات''، ''عدم تعاون''، ''خلافت اندولن'' اور ''نمک قانون'' کا زمانہ کسی صورت اس سے کم نہ تھا۔

آدمی کو محنت کا ثمرہ ضرور ملتا ہے، آزادی کی لڑائی ناکام ہوئی تو ہم ہندوستان والوں کے لئے دوسری نئی راہ کھل گئی اور آزادی کے متوالوں کو مہاتما گاندھی کے ''اہنسا'' کے فلسفے سے تازہ سہارا ملا۔ اگر وطن کی مٹی وطن والوں کے لہو مانگتی رہی تو انہوں نے مقدس خون کا نذرانہ خوشی خوشی حاضر کرنے کی سعادت حاصل کی اور اگر ان کو عدم تشدد کی (اہنسا) طرف آنے کی دعوت ملی تو اس کے لئے وہ ہمہ دم آمادہ ہو گئے۔ آزادی کے شہدا اور آزادی کے رہنماؤں کے ناموں کی فہرست سے اتہاس کی سطر سطر روشن ہے۔ علامہ فضل حق، اشفاق اللہ خاں، مولانا شوکت علی، محمد علی، نہرو، مولانا آزاد، سرحدی گاندھی، حسرتؔ موہانی، مولانا مظہر الحق اور ان کی طرح ہزاروں ہزار اشخاص کے ہاتھوں آزادی کی دلہن آراستہ ہوئی ہے اور دہلی کا لال قلعہ ترنگے کی شان والا ہوا ہے۔ سلام، اُن رہنماؤں کے نام کہ ان کے ساتھ وطن کے لوگ دھرم اور ذات کا فرق مٹا کر آزادی کے لئے، تن، من، دھن نثار کرتے رہے، حتیٰ کہ ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو اللہ کے فضل وکرم سے ملک آزاد ہوا اور وطن کی عظمت رفتہ لوٹ آئی۔ ملک کی آزادی کے لئے لڑنے والوں، مال و دولت لٹانے والوں، زخمی ہونے والوں اور شہادت سے ہم کنار ہونے والوں کا احسان ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے، ہمارے اردگرد، ہر طرف ترنگا لہرا رہا ہے۔ ❁❁

ابراہیم ہوشؔ

...اے پرچم لہرائے جا

قصر وطن پر ، گنگ و جمن پر اے پرچم لہرائے جا
ہندوستاں کے دشت و دمن پر اے پرچم لہرائے جا
ظلم کے خوئے شعلہ فگن پر اے پرچم لہرائے جا
عدل و اخوت کے مسکن پر اے پرچم لہرائے جا
یعنی آزادی کے چمن پر اے پرچم لہرائے جا

راہ کے پیچ وخم سے نہ گھبرا ، ہمت کی توہین نہ کر
یاس کی باتوں سے دل کی جولانی کو غمگین نہ کر
ترکِ سفر سے مقصد کی ناکامی کو سنگین نہ کر
راہبری کے پردے میں منزل کی جھلک دکھلائے جا
صحرا صحرا ، پربت ، پربت اے پرچم لہرائے جا

امیدوں کے پھول کھلا دے ، ہر جنگل ، ہر وادی میں
مستقبل کی شمع جلا دے ہر تاریک آبادی میں
بازی اپنے سر کی لگا دے انساں کی آزادی میں
ہر منزل رستے کی کٹھن ہے ، آگے پاؤں بڑھائے جا
ہوشؔ کے نغموں کے دھارے پر اے پرچم لہرائے جا

(آواز: یکم اگست ۱۹۸۳ء سے ماخوذ)

محمد رضوان احمد
Sabzibagh, Patna - 800004

دو حکمراں، دو کہانی

عزیز بچو! تم نے بادشاہوں اور راجاؤں کی طرح طرح کی کہانیاں سنی ہوں گی اور پڑھی ہوں گی۔ سچ یہ ہے کہ اس دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں، کوئی امیر تو کوئی غریب، کوئی خوش مزاج اور رحم دل تو کوئی بدمزاج اور ظالم جابر۔ دنیا کے حکمرانوں میں بھی نہ جانے کتنے ایسے حکمراں گزرے جن کی نرم دلی اور شرافت مشہور ہے اور نہ جانے کتنے ہی ایسے حکمراں آئے جو ظالم اور جابر حکمراں کہلاتے ہیں، اسی طرح تخت وتاج کے مالک بننے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوئے جنہیں عقلمندی چھوکر بھی نہیں گزری تھی اور ایسے افراد بھی ہوئے جو بلا کی ذہانت رکھتے تھے۔ اب آؤ، اس کی مثال کے لئے دو کہانیاں تمہیں سناتے ہیں۔

ملک مصر کا پرانے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک سال کاشتکاری کرنے والوں کو پانی کی بڑی دقت آ گئی۔ اس زمانے میں دریائے نیل کے کنارے کپاس کی کھیتی خوب ہوا کرتی تھی، مگر کسان اپنی کوششیں کر کے تھک چکے تھے، انہیں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ آخرکار انہوں نے بادشاہ کے دربار میں جانے کا فیصلہ کیا اور اس کے سامنے اپنی فریاد رکھی۔ مقصد یہی تھا کہ حکومت کی طرف سے کوئی انتظام ہو جائے اور مدد مل جائے تاکہ فصل کا زمانہ برباد نہ ہونے پائے۔

بادشاہ نے ان لوگوں کی باتیں سنا، مگر اُسے تو عقل چھوکر بھی نہیں گزری تھی، بادشاہ تھا، مگر پرلے درجہ کا بیوقوف، کہنے لگا:

''پھر تم لوگ کپڑے کی کھیتی کیوں نہیں کر لیتے؟''

کسان بادشاہ کا یہ جواب سن کر کیا کہتے، اندر ہی اندر ہنسنے لگے اور افسوس بھی کرنے لگے۔ بادشاہ کی بیوقوفی اور نادانی اس حد تک تھی کہ وہ کپاس سے روئی کی پیداوار اور روئی سے دھاگے اور پھر کپڑے بننے کی بات سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

بچو! اب آؤ تمہیں ایک دوسرا قصہ سنائیں۔ یہ ایک ہندوستانی راجا کا قصہ ہے۔ اُس راجا کی ذہانت اور رعایا کے لئے اس کی ہمدردی مشہور تھی۔ ایک بار ایک آدمی اس کے دربار میں اپنی فریاد لے کر پہنچا:

''مہاراج! میں بڑی حیرانی میں ہوں۔''

''بتاؤ، کس بات کی...... کیسی حیرانی......؟''

''مہاراج! ہمارے گھر میں چوہے نہیں آتے۔''

راجا کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور اس نے فوراً حکم دیا:

''اس آدمی کے گھر اناجوں کی بوریاں پہنچا دی جائیں۔''

یہ تھی راجا کی ذہانت، اس نے اپنی عقل سے فوراً سمجھ لیا کہ یہ آدمی انتہائی غربت کا شکار ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ خوددار بھی ہے اس لئے اُسے مانگنے میں شرم آ رہی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اناج کا بھنڈار خالی ہوگا، رسوئی گھر میں کھانا نہیں بنے گا تو پھر چوہے یا دوسرے دانہ چننے والے جانور وہاں کیوں آئیں گے۔ گویا راجا کی خداداد عقل سے، اس آدمی کی اپنی خودداری بھی بچی رہ گئی اور اس کی غریبی کا مسئلہ بھی فوراً حل ہو گیا۔

سچ ہے کہ جب حکمراں کے اندر ہی کیا، کسی عام آدمی کے اندر بھی عقل وسمجھ ہوتی ہے اور وہ اس سے کام لیتا ہے تو زمانے والے ہمیشہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔

جہاں تک نام لینے کی بات ہے تو ظلم کرنے والے اور رحم کرنے والے دونوں کا نام لیا جاتا ہے اور بیوقوف اور عقلمند دونوں ہی یاد کئے جاتے ہیں، مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ ایک بدنام ہو کر نام کماتا ہے اور دوسرا نیک نام ہو کر۔ بڑے ہوں یا بچے، انہیں سوچنا یہی ہے کہ وہ کس راستے کو اپنائیں اور جو سمجھ اور ذہانت انہیں ملی ہے اس سے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کس طرح وہ خود بھی جائز فائدے اٹھائیں اور دوسروں کو بھی جائز فائدے پہنچائیں۔

❀❀❀

نصیر احمد عادؔل
Kamhroli, Darbhanga - 847304

پیڑ لگائیں

آؤ بچو پیڑ لگائیں
ہر دل میں یہ جوت جگائیں
پیڑ وہ سایہ دار مگر ہو
جس جا کوئی خوف نہ ڈر ہو
امن و سکوں ہو جس کے نیچے
چین سے بیٹھیں آنکھیں میچے
جس جا ہو نہ دھوپ کی شدت
سب کو ہی محسوس ہو راحت
بیٹھیں سب بے خوف جہاں پر
ذکر جس کا ہر ایک زباں پر
بیٹھیں سب تفریق بھلا کر
دل سے شکوے دور بھگا کر
جس سے دنیا لطف اٹھائے
پیڑ جو سارے جگ کو بھائے
بھائی چارہ اور محبت
پھیلے گھر گھر جس سے الفت
عادؔل ایسے گیت سناؤ
جس سے سب کو ایک بناؤ

❀❀❀

التفات رضا
C/o "Book Emporium" Sabzibagh, Patna - 800004

حج مبارک

حج مبارک ابو جان
حج مبارک امی جان
اللہ کا ہے یہ فرمان
حج بھی ہے اللہ کی شان
حاجی اللہ کے مہمان
حج سے ہوں گے سب ذیشان
حج مبارک ابو جان
حج مبارک امی جان
ابو پہنے ہیں احرام
رب کا ہر دم لیتے نام
طواف کریں گے صبح و شام
رب سے پائیں گے انعام
حج مبارک ابو جان
حج مبارک امی جان
لوٹ کے امی ابو آئے
حجن ، حاجی وہ کہلائے
دنیا داری کچھ نہ بھائے
ان سے رب راضی ہو جائے
حج مبارک ابو جان
حج مبارک امی جان

❀❀❀

غزل

قمر زاہدی

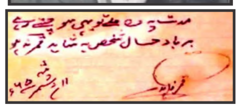

غزل کو مری نطق جذبات دے دو
گھٹا غم کی چھائی ہے ، برسات دے دو

بہت قیمتی ہیں تمہارے یہ آنسو
میں دامن پسارے ہوں ، خیرات دے دو

کوئی کب ہے جیتا محبت کی بازی
جہاں جیسے چاہو ، مجھے مات دے دو

الگ راستے ہیں ، جدا منزلیں ہیں
چلو ، چل کے اس موڑ تک ساتھ دے دو

لگیں میزباں کی طرح مجھ کو راہیں
مرے ہاتھ میں اپنا گر ہاتھ دے دو

ہزاروں سحر دھو کے شبنم سے دے دوں
جو شب رنگ زلفوں کی اک رات دے دو

رگِ جاں کی میری ضیافت تو ہوگی
نہیں گل تو کانٹے ہی سوغات دے دو

بخوبی میں یہ فرض انجام دوں گا
مرے ذمہ صحرا کی خدمات دے دو

بیک لخت تھم جائے عالم کی گردش
قمر کو جو اک چاندنی رات دے دو

قمر زاہدی کا پورا نام قمر الحسن زاہدی ابن ڈاکٹر سید شمس الحسن زاہدی ابن زاہد حسین ہے۔ وہ ۲۶ ؍اگست ۱۹۳۷ء کو اس دنیا میں آئے اور ۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو اس جہاں سے چل بسے۔ قمر زاہدی کی جائے ولادت گیا اور جائے وفات پٹنہ ہے۔ انہیں اگر چہ صغر سنی میں والد کی وفات اور نوعمری میں بھائی اور والدہ کی رحلت کے صدمات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا اور ادب و صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ کلکتہ اور پٹنہ کے مختلف اخبارات میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک انہوں نے سب ایڈیٹر کی خدمتیں انجام دیں، پھر محکمہ تعمیرات عامہ کے اکاؤنٹس سکشن کی ملازمت سے ۱۹۹۳ء میں سبکدوشی کے بعد اپنا تمام تر وقت، خدمت ادب کے لئے وقف کر دیا۔ قمر زاہدی ترقی پسند تحریک سے وابستگی رکھتے تھے اور علی سردار جعفری کے لفظوں میں ''نہایت خوشگو شاعر'' تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''چشم نم'' ۱۹۷۸ء میں چھپا تھا جس کا مقدمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے لکھا ہے۔ قمر زاہدی کا دوسرا مجموعہ ''ساز حیات'' ان کی وفات کے بعد ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا ہے جسے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر مظہر اقبال زاہدی نے ترتیب دیا ہے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 **August - 2024** **No. 08**

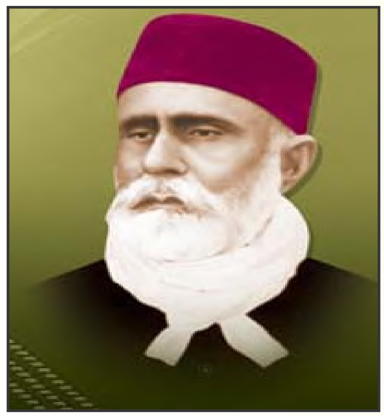

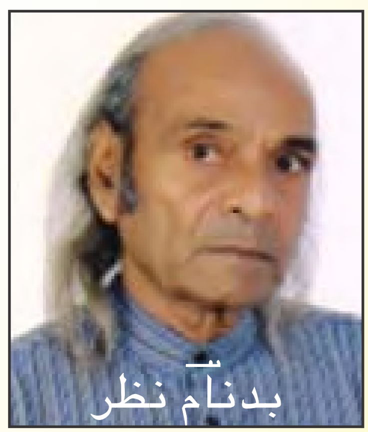

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15